إِنْ أُرِيْدُ إِلَّا الْإِصْلَاحَ مَا اسْتَطَعْتُ

دسمبر ۲۰۲۰ء

ماہنامہ

البرہان

لاہور

مدیر ڈاکٹر محمد امین

ڈاکٹر محمد امین کی چند اہم تصانیف

	قیمت
❁ ہمارا تعلیمی بحران اور اس کا حل	۶۰۰ روپے
❁ اسلامی سکول کے خدوخال	۱۵۰
❁ تعلیم اور اس کا اسلامی کردار	۳۰۰
❁ یکساں قومی نصاب۔ خدشات و مضمرات	۲۵۰
❁ تعلیمی ادارے اور کردار سازی	۲۵۰
❁ تعلیمی اداروں میں تعمیر سیرت۔ ہینڈ بک و گائیڈ	۳۰۰
❁ تدریس القرآن (۱) برائے معلمین	۲۰۰
❁ تدریس القرآن (۱) برائے طلبہ و طالبات	۱۰۰
❁ پنج سورہ (اُردو تفہیم، ڈاکٹر محمد امین)	۱۰۰
❁ ہمارا دینی نظام تعلیم	۴۵۰
❁ نصابِ مدنیؒ	۸۰
❁ مدرسہ ڈسکورسز۔ مطالعہ و تجزیہ	۲۵۰
❁ اسلام اور تزکیۂ نفس (مغربی فکر کے ساتھ تقابلی مطالعہ)	۱۲۰۰
❁ حقیقتِ تزکیۂ نفس (سوالاً جواباً)	۸۰
❁ ترکِ رذائل (احمد جاوید)	۳۵۰
❁ مسلم نشاۃ ثانیہ۔ اساس اور لائحہ عمل	۴۷۵
❁ اسلام اور تہذیبِ مغرب کی کشمکش	۳۵۰
❁ اسلامی اور مغربی اصطلاحات کا تقابلی مطالعہ	۲۵۰
❁ اسلام اور ردِّ مغرب	۳۰۰
❁ عصرِ حاضر میں دین کا متوازن تصور	۱۷۰
❁ شاتمِ رسول کے قتل کی شرعی حیثیت	۵۰

مکتبہ البرہان، 97-A نیلم بلاک، علامہ اقبال ٹاؤن، لاہور، **0309-4607124**

ڈاکٹر محمد امین کی نئی فکر انگیز تصنیف

پاکستان کی دینی قوتیں غیر مؤثر اور ناکام کیوں؟

ایک فکری تجزیہ

- ❁ موجودہ دینی جدوجہد کے غیر مؤثر ہونے کے مظاہر، اسباب اور نتائج
- ❁ بگاڑ کے اسباب اور ذرائع
- ❁ تفکیرِ نو اور تشکیلِ نو کے بنیادی اُصول اور تجاویز
- ❁ پس چہ باید کرد (ایک ہمہ جہت اصلاحی تحریک کی ضرورت)

صفحات: ۲۴۰ قیمت: ۳۰۰ روپے

مکتبہ البرہان

97-A نیلم بلاک، علامہ اقبال ٹاؤن، لاہور

فون: 0309-4607124، ای میل ermpak@hotmail.com

ماہنامہ
البرہان
لاہور
جلد ۲۴، شمارہ ۱۲، دسمبر ۲۰۲۰ء/ ربیع الثانی ۱۴۴۲ھ

مشمولات

○فکر و نظر
مسلم فکر و دانش کی پسپائی — مدیر — ۴

○تعلیم و تربیت
- دینی مدارس کا نظام تعلیم - بنیادی تبدیلیاں ناگزیر ہیں — احمد جاوید — ۹
- تعلیمی دہشت گردی — پروفیسر ملک محمد حسین — ۲۲

○سیرت النبی
سیرتِ رسول - مغرب کی گواہی — مائیکل ہارٹ — ۲۵

○اسلام اور پاکستان
- پاکستان میں غلبۂ دین کیسے ممکن ہے؟ — ڈاکٹر محمد امین — ۲۶
- اقبال ہمیں وارا نہیں کھاتا — عابد اقبال کھاری — ۳۳

○عالم اسلام
امت مسلمہ کے خلاف مسیحی صہیونی گٹھ جوڑ — مدیر — ۳۸

○اسلام اور مغرب
مغرب کا ہیومن رائٹس کا تصور غیر اسلامی ہے — ڈاکٹر زاہد صدیق مغل — ۴۴

○تفہیم دین
کیا 'عقیدے' کی بحثوں میں 'ایمان' گم ہوگیا ہے؟ — مدیر — ۵۲

○اتحاد امت
آدابِ اختلاف — ڈاکٹر اختر حسین عزمی — ۵۵

○ایک لوہار کی
اللہ ہمارے حال پر رحم فرمائے — پروفیسر ملک محمد حسین — ۵۷

○تبصرۂ کتب
حافظ محمد موسیٰ بھٹو اور ڈاکٹر اختر احمد کی کتابیں — مدیر — ۵۸

مدیر: ڈاکٹر محمد امین
نائب مدیر: پروفیسر ملک محمد حسین

انچارج سرکولیشن
(0309-4607124)
[برائے خریداری، تجدید، شمارہ تاخیر سے ملنے کی شکایت اور مکتبہ البرہان کی کتب کی خریداری کے لیے]

زرِ اعانت: فی شمارہ 45 روپے
سالانہ 500 روپے۔ پانچ سال: 2000 روپے
تاحیات 10,000 روپے

تحریک اصلاحِ تعلیم ٹرسٹ
سونیری بنک لمیٹڈ، مین برانچ، لاہور
A/c # 02011478219

برائے رابطہ
A-97 نیلم بلاک، علامہ اقبال ٹاؤن، لاہور 54700
ادارتی امور
ermpak@hotmail.com

برائے آن لائن مطالعہ
www.alburhanmonthly.org

کمپوزنگ: حافظ محسن یوسف
0306-4640366

فکر ونظر

مغرب کی ملحدانہ فکر وتہذیب کے مقابلے میں

مسلم فکر ودانش کی پسپائی

مسلم مفکرین، مصلحین، علماء اور دانشوروں کو فکری استقلال اور یکسوئی کی ضرورت ہے

اسلام اور مسلمانوں پر اتنا کڑا وقت شاید ہی کبھی آیا ہو اور ان کے اہل علم وفکر کو اتنے بڑے فکری، علمی، تہذیبی اور عملی چیلنج کا شاید ہی کبھی سامنا کرنا پڑا ہو جس سے وہ اس وقت دو چار ہیں۔ جب یونانی فکر وتہذیب کا حملہ ہوا تو مسلم فکر وتہذیب اپنے عروج پہ تھی، اس نے نہ صرف اس کا مقابلہ کیا بلکہ اسے دھول چٹا دی اور اس کے متاثرین ہوا میں بکھر گئے۔ منگولوں کی وحشیانہ جنگجوئی نے بلاشبہ مسلم حکومتوں کو تہہ وبالا کر ڈالا لیکن وہ کسی بڑی فکر وتہذیب کے علمبردار نہ تھے چنانچہ تھوڑے ہی عرصے میں مسلم فکر وتہذیب نے انہیں مغلوب کر لیا اور وہ فاتح سے مفتوح ہو گئے۔

لیکن مغربی فکر وتہذیب کا رنگ نرالا ہے۔ اس نے نہ صرف اپنی حربی قوت سے مسلم دنیا کو تہہ وبالا کر ڈالا ہے بلکہ اس کی علمی، فکری اور تہذیبی قوت نے مسلم اہل علم ودانش کو بھی جکڑ لیا ہے اور اس پر مستزاد یہ کہ وہ جاہلیت خالصہ ہے، صریح کفر، شرک اور الحاد پر مبنی ہے، اسلام کی سو فیصد نقیض ہے اور دین ماسوی اللہ ہے۔ فکر مندی اور افسوس کا مقام یہ ہے کہ مسلم اہل علم ودانش اسے علمی اور فکری سطح پر رد نہیں کر سکے۔ اس لیے کہ دشمن طاقتور ہونے کے ساتھ ساتھ عیار اور سازشی بھی ہے۔ اس نے علاقے فتح کرنے پر قناعت نہیں کی بلکہ اس نے مسلمانوں کے دل ودماغ فتح کرنے پر بھی توجہ مرکوز کی اور اس کے لیے اس نے ایسی حکمت عملی اختیار کی جس نے اسے کامیابی دلائی۔ اس کے لیے اس نے حربی اور سیاسی تفوق کے ساتھ تعلیم، ادب اور ثقافت کے خاموش ہتھیار استعمال کیے اور مسلمانوں کے قلوب واذہان کو اپنی مرضی کے مطابق بدلنے میں کامیاب ہو گیا۔

افسوس کہ مسلم مفکرین، مصلحین، علماء اور دانشور اس کی چالوں کو سمجھ نہ سکے اور اس کا توڑ نہ

کر سکے بلکہ ان میں سے اکثر اس وباء کا شکار ہوگئے جس کا نام ''مغرب کی ملحدانہ فکر وتہذیب کا غلبہ'' ہے۔ وہ یا تو اس کے غلبے سے فکری طور پر مرعوب ہوگئے یا اس کے ردّ عمل کا شکار ہوگئے۔ دونوں صورتوں میں وہ اس کا ردّ کرنے میں ناکام رہے اور بتدریج اس کو حیلے بہانے قبول کرنے کے مرحلے میں داخل ہوگئے۔ اس وقت مسلم اہل علم ودانش کی جو فکری کیفیت ہے اور مغرب کی الحادی فکر وتہذیب کے غلبے کے خلاف ان کا جو رسپانس ہے اس کی مندرجہ ذیل صورتیں ہمارے سامنے آتی ہیں:

متلفّقین (Revisionists/Reconciliators)

تلفیق اسلامی فقہ کی ایک اصطلاح ہے جس کا مطلب ہے دو مختلف فقہی مسالک کو باہم Compatable سمجھتے ہوئے ملانا۔ گویا متلفقین وہ سکالرز ہیں جو اس امر کے قائل ہیں کہ اسلام اور مغربی فکر وتہذیب کی تلفیق ممکن ہے۔

یہ وہ اہل دانش ہیں جو مغربی فکر اور اس کے اداروں کو اسلام کا نقیض نہیں سمجھتے بلکہ ان کا خیال ہے کہ ان میں اگر تھوڑے بہت اسلامی عناصر ملا دیے جائیں تو وہ اسلام کے مطابق یعنی Shariah Compliant ہو جاتے ہیں۔ چنانچہ انہوں نے مغرب کی ملحدانہ، لبرل، سیکولر اور سرمایہ دارانہ جمہوریت میں کچھ اسلامی اصول داخل کر کے اسے مشرف بہ اسلام کرلیا اور اسے 'اسلامی جمہوریت' کہنا شروع کر دیا۔ اسی طرح وہ یہ بھی سمجھتے ہیں کہ مغربی نیشنلزم پر مبنی 'قومی ریاست' کو 'اسلامی ریاست' میں بدلا جاسکتا ہے اور اس میں اسلامی قوانین کا اجراء کر کے اس میں دین کو غالب کیا جاسکتا ہے۔

ایسے ہی بعض مسلم اہل علم یہ سمجھتے ہیں کہ مغرب کے نظام سرمایہ داری میں جو یقیناً اسلام کی نقیض الحادی بنیادوں پر استوار ہے، اگر اس میں کچھ اسلامی اصول داخل کر دیے جائیں تو اسے اسلام کے اقتصادی نظام کے قریب لایا جاسکتا ہے اور اس سے وہ مقاصد حاصل کیے جاسکتے ہیں جو اسلام کے اقتصادی نظام کے پیش نظر ہیں مثلاً مغرب کے بنکاری نظام سے اگر سود ختم کر دیا جائے تو وہ 'اسلامی بنکنگ' ہو جائے گی اور وہ مالیات کے اسلامی مقاصد پورے کرنے لگے گی۔

اس کی ایک مثال اقوام متحدہ کا انسانی حقوق کا چارٹر بھی ہے۔ اس چارٹر کے حقوق ہیومنزم، لبرل ازم، سیکولرزم وغیرہ کی پیداوار ہیں جن کا مبنیٰ انسان کی لامحدود آزادی اور خود مختاری ہے۔ انسان کو حق ہے کہ جو چاہے کھائے (مثلاً خنزیر کا گوشت)، جو چاہے پیئے (جیسے شراب)، جس سے چاہے شادی کرے (خواہ وہ کافر ہو)، جیسے چاہے کمائے (مثلاً جوا کھیل کر)۔ انسانی حقوق کے چارٹر کی رو سے یہ سب کام جائز اور قانونی ہیں کیونکہ اہل مغرب کے نزدیک یہ ہر فرد کا ذاتی ''حق'' ہیں اور دنیا کا کوئی مذہب، کوئی دستور، کوئی قانون ان انسانی حقوق'' کی خلاف ورزی نہیں کر سکتا۔ لیکن کئی مسلم دانشور کہتے ہیں کہ یہ حقوق مطابق اسلام ہیں اور یہ اسلام میں ''حقوق العباد'' سے ملتے جلتے ہیں یا ان حقوق سے ملتے جلتے ہیں جن کا ذکر نبی کریم ﷺ نے حجۃ الوداع میں اپنے خطبے میں فرمایا تھا۔

یوں یہ اسلامی مصلحین مغرب کی الحادی فکر و تہذیب کی اسلام کاری (Islamization of Western Thought and Civilization) میں مصروف ہیں اور اسے اسلام کی بہت بڑی خدمت سمجھتے ہیں۔

متجددین (Modernists)

بعض مسلم اہل علم سمجھتے ہیں کہ مغربی فکر و تہذیب اگر دنیا میں غالب ہے تو اس وجہ سے کہ اس میں بہت سی خوبیاں ہیں اور ان میں سے اکثر خوبیاں وہ ہیں جن کی اسلام تائید کرتا ہے۔ دوسری طرف وہ یہ دیکھتے ہیں کہ علماء کرام کی اکثریت پہلے گزرے فقہاء کی تقلید پر مطمئن ہے۔ یہ لوگ اجتہاد نہیں کرتے اور نہ عصری مسائل اور ضرورتوں کا اسلامی تعلیمات کی روشنی میں حل پیش کرتے ہیں۔ یہ سکالرز اور دانشور اس کا حل یہ پیش کرتے ہیں کہ اسلام کی ایسی تشریح اور توضیح کی جائے جو مغربی فکر و تہذیب اور اس کے اصول و اقدار اور اداروں پر فِٹ بیٹھے۔ اسلام کو مغربی فکر و تہذیب کے جامے میں ڈھالنے کے لیے انہیں اس کی جو کتر بیونت کرنی پڑتی ہے اس میں دو چیزیں حائل ہوتی ہیں۔ ایک تو سنت رسول جو قرآن حکیم کی تبیین کرتی ہے اور دوسرے جمہور امت اور جمہور اہل علم کی تعبیر دین۔ قرآن کی من مانی تفسیر کرنے اور اسے بطور دلیل اپنے حق میں پیش کرنے کے لیے وہ سنت رسول کو ردّ کرنے کا یہ طریقہ

نکالتے ہیں کہ احادیث کو احاد، ظنی، خلاف قرآن یا خلاف عقل کہہ کر ردّ کر دیتے ہیں اور اسلاف کے فہم دین کو یہ کہہ کر ردّ کر دیتے ہیں کہ یہ پرانے زمانے کے اجتہادات پر مبنی ہے۔ نئے حالات میں نئے اجتہاد اور نئی تعبیر دین کی ضرورت ہے۔ یوں یہ متجددین اسلام کی مغرب کاری یعنی Westernization of Islam کرتے ہیں۔

مستشرکین (Humanists / Secularists)

مغربی فکر و تہذیب کے غلبے سے مرعوب اور اسے اپنانے کے خواہش مند مسلم سکالرز میں سے کئی ایسے ہیں جو یہ کہتے ہیں کہ اسلام تو ہیومنزم اور سیکولرزم کا حامی ہے۔ اب ہیومنزم اور سیکولرزم کیا ہے؟ نشأۃ ثانیہ کی ابتداء میں مغربی دانشور اپنی اس مذہبی قیادت سے بغاوت پر مجبور ہوئے جو آمر بادشاہ اور جاگیرداروں سے مل کر عوام کو ظلم کی چکی میں پیس رہے تھے، ان کی زادیٔ فکر کو کچل رہے تھے اور غیر سائنسی، غیر فطری، انحراف شدہ مذہب ان پر مسلط کر رہے تھے چنانچہ ان کو نجات کی صورت یونانی فکر کی صورت میں نظر آئی جو وحی کی ہدایت سے محروم تھی اور خدا کے مقابلے میں انسان کو خود مختاری دیتی تھی۔

جب یوں ہیومنزم کا نظریہ ابھرا جس نے انسان کو خدائی اختیارات تفویض ادا کر دیئے۔ مغرب میں ہیومنزم نے انسان کی خدائی کا ڈنکا بجایا تو عیسائی معاشرے میں اضطراب پیدا ہوا اور اس کا حل مغربی دانشوروں نے سیکولرزم کی صورت میں ڈھونڈ نکالا۔ انہوں نے مذہبی لوگوں کو کہا کہ آپ لوگ اپنی انفرادی زندگی میں اللہ کی عبادت کریں، اس سے دعا مانگیں، روزے رکھیں، ہمیں اس پر کوئی اعتراض نہیں، البتہ اجتماعی زندگی میں، معاشرے اور ریاست کے امور میں، اللہ اور مذہب کا کوئی دخل نہ ہوگا۔ مطلب یہ کہ انسان چونکہ آزاد اور خود مختار ہے لہٰذا اس کی مرضی ہے جہاں چاہے اللہ کو اور اس کے اقتدار کو مانے اور جہاں چاہے نہ مانے۔ گویا اس نظریے نے انسان کو اللہ کا شریک بنا دیا کہ انفرادی زندگی میں اللہ کا حکم چلے گا اور اجتماعی زندگی میں انسان کا۔ اسلام میں اس چیز کو شرک سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ اسی لیے ہم نے سیکولرسٹوں کے لیے 'مستشرکین' کی اصطلاح وضع کی ہے۔ یعنی یہ لوگ بالواسطہ طور پر شرک میں مبتلا ہوتے ہیں۔ مسلمانوں میں بہت سے متجددین سیکولرازم کی براہ راست یا بالواسطہ حمایت کرتے ہیں اور اس غرض سے سنت، اجماع اور تعامل امت کو رد کرنے کے لیے طرح طرح کی بودی دلیلیں

دیتے ہیں جیسے اظہار دین سے مراد اسلام کا فکری غلبہ ہے نہ کہ سیاسی اور حربی غلبہ۔ آج کل جہاد کا مطلب علمی، فکری قلمی جہاد ہے نہ کہ جہاد بمعنی قتال۔ اسلام اخلاقی انقلاب کا علمبردار ہے نہ کہ ریاستی اقتدار کا طالب وغیرہ۔

جمودیین (Rigids/Conservatives)

یہ وہ علماء وصلحاء ہیں جنہیں مغربی فکر وتہذیب کے چیلنج کا احساس ہی نہیں۔ جنہیں یہ ادراک ہی نہیں کہ مغربی فکر وتہذیب نے اسلام اور مسلمانوں کو کیسے زک پہنچائی ہے اور مسلم معاشرے کو کن مسائل سے دو چار کر دیا ہے جن کے حل کی ضرورت ہے۔ یہ لوگ مغربی فکر وتہذیب سے مرعوب تو نہیں لیکن اس کے ردّ عمل کا شکار ضرور ہیں۔ یہاں تک کہ وہ انگریزی زبان اور مغربی علوم کا تفہیمی، تنقیدی اور تقابلی مطالعہ کرنے کی ضرورت بھی محسوس نہیں کرتے۔ ان میں ہماری دعوتی واصلاحی جماعتیں، دینی مدارس اور تصوف کے حلقے شامل ہیں۔ یہ علماء اپنے فقہی وکلامی مسالک اور ان کے ائمہ کی تقدیس کے قائل ہیں۔ ان کی اقتداء کو کافی سمجھتے ہیں اور کسی نئے اجتہاد کی ضرورت محسوس نہیں کرتے۔ متلففین، متجددین اور مستشرکین کا مؤقف اگر دین کے لیے مضر ہے تو ان اصحاب علم وفضل کا مؤقف بھی دین کے لیے سخت نقصان دہ ہے لیکن انہیں اس کا احساس ہی نہیں۔

مؤحدین (Rightful Traditionalists)

یہ وہ اصحاب علم وفضل ہیں جو صحیح الفکر ہیں۔ جنہیں مغربی فکر وتہذیب کے چیلنج کا ادراک ہے۔ یہ دلائل کی بنیاد پر اسے ردّ کرتے ہیں اور اسے اسلام مخالف ثابت کرتے ہیں۔ یہ اسلاف اور جمہور علماء کے کام کی قدر کرتے ہیں لیکن نئے اجتہاد کی ضرورت کا بھی اثبات کرتے ہیں اور مسلم معاشرے کو درپیش مسائل اسلامی تناظر میں حل کرنا چاہتے ہیں۔ یہ نہ تو مغربی فکر وتہذیب سے مرعوب ہیں اور نہ اس کے ردّ عمل کا شکار ہیں۔ ایسے اصحاب فکر ودانش کم ہیں لیکن اسلام کا اثاثہ یہی لوگ ہیں اور انہی سے امیدیں وابستہ ہیں کہ ان کی جدوجہد ہی صراط مستقیم کے راستے کھولے گی اور ماضی سے پیوستگی کے ساتھ وہ مستقبل کی راہیں کشادہ کرسکیں گے۔

تعلیم و تربیت

احمد جاوید

دینی مدارس کا نظام تعلیم۔ بنیادی تبدیلیاں ناگزیر ہیں

[یہ وہ تحریر ہے جو احمد جاوید صاحب نے ہماری کتاب 'ہمارا دینی نظام تعلیم' کی تقریظ کے طور پر لکھی تھی۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ مقالہ بہت وقیع ہے اور ہمارے بس میں نہیں کہ ہم اسے دینی مدارس چلانے والے ہر عالم دین تک پہنچا دیں۔ اس تحریر میں جناب احمد جاوید احمد نے جو تجاویز اصلاح دینی مدارس کے لیے دی ہیں وہ اتنی بنیادی اور انقلابی ہیں کہ ان کے لیے مدرسہ کا ایک نیا ماڈل درکار ہے۔

دینی مدارس کی اصلاح کے حوالے سے علماء کرام کا ردعمل بعض اوقات اتنا حوصلہ شکن ہوتا ہے کہ ان پر گفتگو کرتے ہوئے آدمی اپنے درد کے ہاتھوں بعض اوقات تلخی پر اتر آتا ہے گویا ۔ نوا را تلخ ترمی زن چوں ذوق نغمہ کم یابی ۔ جناب احمد جاوید کو ان سطور پر نظر ثانی کا موقع بھی نہ مل سکا تھا لہٰذا ہم نے "ادارتی اختیار" استعمال کرتے ہوئے ان کے بعض الفاظ کو نرم کر دیا ہے۔

ہم اہل مدارس سے درخواست کرتے ہیں کہ وہ احمد جاوید صاحب کی ان تجاویز پر سنجیدگی سے غور فرمائیں۔ مدیر]

دینی مدارس کے نظام تعلیم کو مزید مفید اور مؤثر بنانے کے لیے ہماری تجاویز درج ذیل ہیں:

ا۔ تعلیم کا پورا نظام قرآن وسنت کی بنیاد پر بننا چاہیے اور اس کے نتیجے میں قرآن وسنت کا صحیح علم اور ان کے ساتھ ذہن اور طبیعت کی پوری مناسبت ہاتھ آنی چاہیے۔ مدارس کا موجودہ نظام تعلیم اس مرکزی ضرورت کو پورا نہیں کرتا۔

اس ناکامی کا بڑا سبب یہ ہے کہ دین کی ان دو بنیادوں سے ہمارے تعلق میں واسطے بہت زیادہ آ گئے ہیں۔ دین کی قانونی اور کلامی تعبیرات بہت اہم سہی لیکن ان میں محدود رہ جانے کی وجہ سے قرآن وسنت کو ہمارے مجموعی رویوں میں جس اٹل مرکزیت کا حامل ہونا چاہیے ہم نے اس کا شعور بھی گنوا دیا ہے۔ یہ تلخ بات ہے لیکن اصلاح احوال کی نیت سے اس کا اظہار ضروری ہے کہ اہل مدارس، خواہ وہ کسی بھی مکتب فکر سے متعلق ہوں، ان کا مزاج یکساں

ہے اور اس مزاج کی تشکیل میں اصل دین یعنی قرآن وسنت کا کردار بہت کم ہے۔ اس انتہائی بنیادی کمی کا اگر ازالہ نہ کیا گیا تو دین ایک ایسے طبقے تک محدود رہ جائے گا جو دین کی ترجمانی کا مدعی تو ہوگا لیکن اس کا حقیقی مظہر بننے کی صلاحیت اس میں تھوڑی ہوگی۔

مقام افسوس ہے کہ دینی نمائندگی کی یہ حالت ہمارے مدرسوں ہی نے پیدا کی ہے۔ موجودہ دینی نظام تعلیم کے معلم اکثر دین کو اخلاق و کردار کی زندہ بنیاد کے طور پر اپنے طلبہ میں منتقل کرنے کی اہلیت نہیں رکھتے۔ یہ کافی سمجھ لیا گیا ہے کہ ایک خاص حلیہ اختیار کر کے بعض مسائل اور چند مقدمات، جن کی غالب حیثیت عموماً مناظرانہ ہوتی ہے، رٹوا دیئے جائیں تو طالب علم عالم کی مسند پر بیٹھنے کا استحقاق حاصل کر لیتا ہے۔ یہ تصویر ہر پہلو سے غیر مطلوب ہے۔ دین کا مخاطب کوئی خاص ٹائپ یا محض حافظہ نہیں ہے۔ اس کا مقصود اصلی تزکیہ ہے اور عالم بننے کا مطلب اس کے سوا کچھ اور نہیں کہ ایک باعمل، متقی اور مخلص مسلمان تزکیے کے عملی وسائل پر بھی دسترس حاصل کر لے۔ اس مقصود کا حصول تو دور کی بات ہے، ہمارے مدارس اس کی طرف بڑھنے کی خواہش بھی نہیں پیدا ہونے دیتے۔ ان کا زیادہ زور اپنے اپنے مسلک سے غیر مشروط اور جارحانہ وابستگی پر ہے۔ اس سلسلے میں ہماری اصل تجویز تو وہی ہے جو ہم اوپر بیان کر چکے ہیں لیکن اس کی تفصیل کی طرف پیش رفت کرنے سے پہلے اہل مدارس کو اپنے مقاصد میں اساسی ترمیم کرنی پڑے گی اور وہ یہ ہے کہ قرآن وسنت پر خود کو از سر نو استوار کرنے کے لیے اس ذہن کو پیدا کرنا ہوگا جس کے لیے اس کا مسلک ہر درجہ قابل قبول ہونے کے باوجود پورے دین کا احاطہ نہیں کرتا اور اس کی حیثیت ایک امکانی طور پر درست تعبیر سے زیادہ نہیں ہے۔

ہمارے مدارس میں تعلیم وتربیت کی سطح پر یہ ماحول پیدا ہونا چاہیے کہ مقلدین غیر مقلدوں کی دینی افادیت کی تحسین کریں اور غیر مقلد مقلدوں کی۔ فقہ، مثال کے طور پر حنفیوں سے سیکھ لیں اور حدیث کی سند اہل حدیث سے لے آئیں۔ بالفاظ دیگر ہر مکتب فکر کے طالب علم کو دوسرے مکتب فکر کی دینی ضرورت کا ادراک، احساس اور اعتراف ہونا چاہیے۔ اختلافات کو ٹھوس تحقیقی سطح اور علمی مرتبے سے نیچے نہیں گرنے دینا چاہیے اور پھر یہ بھی کہ اکثر اختلافات کی نوعیت پہلے دن سے واضح ہونی چاہیے جو صحیح و غلط کی نہیں ہے بلکہ راجح و مرجوح کی ہے۔ جہاں صحیح اور غلط کا فرق ناگزیر ہو، وہاں بھی دوسروں کے لیے اسی رویے کا مظاہرہ کرنا

چاہیے جو کسی مسلک کا پیرو اپنے بڑوں کے لیے روا رکھتا ہے یعنی یہ غلطی اجتہادی ہے اور اس کا مبنی غلط نہیں ہے۔ اگر یہ نہ کیا تو پھر اہل مدرسہ اس الزام کے آگے اپنا دفاع نہیں کرسکیں گے کہ یہ لوگ مسلک کو دین پر اور امام کو نبی علیہ السلام پر ترجیح دیتے ہیں اور جن فطری اختلافات کی بنیاد پر مختلف مکاتب فکر وجود میں آتے ہیں یہ انہیں مستقل فرقوں میں تبدیل کررہے ہیں۔ اس سلسلے میں عملی اقدامات کی تفصیل ان شاء اللہ آگے آئے گی۔

۲۔ طالب علموں کے لیے دین کو فقہ، تفسیر، کلام وغیرہ کا رنگ دینے کی بجائے ضروریات دین کا علم، اس کی تفصیل اور اس پر طبیعت کی آمادگی کے ساتھ عمل سکھانا چاہیے۔ آگے کے تعلیمی مراحل اس وقت تک شروع نہیں کروانے چاہئیں جب تک مذکورہ بالا پہلا درجہ اچھی طرح مکمل نہ ہوجائے۔ دین کا ذوق اور اس پر عمل میں رسوخ پیدا کیے بغیر کسی طالب علم کو متخصص عالم بنانے کی کوشش بے سود ہے۔ تخصص فی العلم ایک باعمل اور باذوق مسلمان ہی کے لیے جائز ہے ورنہ اس کا نتیجہ خود دین کی بے توقیری کی شکل میں نکلتا ہے۔

۳۔ مدارس میں کسی نہ کسی مسلک کی غالب حیثیت ناگزیر اور فطری ہے مگر اس نے ہمارے زمانے میں اپنے حدود سے تجاوز کررکھا ہے۔ مسلک کی منفی گرفت کو توڑنے کا اہتمام کیے بغیر آدمی دین کی اصل روح اور دینی علم کے حقیقی مقصود یعنی اللہ و رسول ﷺ کی اطاعت کا واضح شعور پیدا نہیں کرسکتا۔ اس صورتِ حال سے نکلے بغیر اوّل تو دینی علم کا حصول ہی محال ہے اور دوسرے معاشرے میں عالم کا مطلوبہ کردار بری طرح متاثر ہوتا ہے جیسا کہ ہم دیکھتے ہیں کہ مسلک دین پر اور فتویٰ نص پر غالب آگیا ہے۔ اس سلسلے میں ہماری تجویز یہ ہے کہ استاد کی حیثیت سے بہترین آدمی کا تقرر ہونا چاہیے خواہ اس کا تعلق کسی بھی تسلیم شدہ مسلک سے ہو۔ مثال کے طور پر تفسیر حنفی پڑھا سکتا ہے حدیث حنبلی پڑھا سکتا ہے اور عربی کوئی اہل حدیث پڑھا سکتا ہے تو اس میں دریغ نہیں کرنا چاہیے۔ اس طرح کے حالات پیدا کردیئے جائیں تو تفرقے کی اکثر بنیادیں خود بخود منہدم ہوجائیں گی اور یہ محض کوئی خیال نہیں ہے، ندوۃ العلماء میں یہ تجربہ کامیابی سے کیا جاچکا ہے۔

۴۔ اساتذہ کی ذمہ داری ہے کہ وہ صرف معلم اور مدرس بننے پر اکتفا نہ کریں بلکہ مربی بننے کی اہلیت بھی پیدا کریں۔ اسلام کا معلم تو وہی ہوسکتا ہے جو مربی بھی ہو۔

۵۔ اہل مدارس کو دعوت کے کام پر خصوصی توجہ دینی چاہیے۔ اس کا ایک جزء یہ ہے کہ وہ معاشرے کے طبقات بالا میں سے طلبہ کو اپنی طرف مائل کرنے کی کوشش کریں۔ اس طرح ایسی بہت سی خرابیوں کا ازالہ ہو جائے گا جو دینی مدرسوں کے طالب علموں میں عام نظر آتی ہیں مثلاً احساس کمتری، دوسروں کے لیے نفرت، کم ذہنی، حبّ دنیا وغیرہ۔ ہمارے خیال میں خرابی کا سبب یہ ہے کہ مدارس میں وہی بچے بچیاں داخل ہوتے ہیں جن کے والدین یا تو ان کی کفالت کا بوجھ نہیں اٹھا سکتے یا پھر وہ ذہنی سطح کے اعتبار سے اتنے پست ہوتے ہیں کہ جدید تعلیم کا حصول ان کے لیے ممکن نہیں ہوتا۔ جو کسی کام کا نہ ہو وہ مدرسے میں بھیج دیا جاتا ہے۔ یہ پوری کھیپ ایک مضبوط اور متوازن نظام تربیت کی غیر موجودگی میں اور اہل اساتذہ کے تقریباً فقدان کی صورت حال میں جو کچھ بن سکتی ہے وہ ہمارے سامنے ہے۔

۶۔ تعلیم کا آغاز قرآن مجید سے کیا جائے جس کی ترتیب یہ ہونی چاہیے:

- صحت ادائی
- لفظی ترجمہ
- عقائد واحکام کی تفصیل
- عربی زبان کی تعلیم
- اس کے بعد سنت وسیرت کی تفصیلی تعلیم
- پھر درجۂ تخصص میں فقہ وغیرہ

قرآن کی تعلیم میں یہ بات ضرور پیش نظر رہنی چاہیے کہ صرف فہم مطلوب نہیں ہے بلکہ کلام الٰہی کا وہ تاثر بھی مطلوب ہے جس کے نتیجے میں اللہ تعالیٰ کی عظمت، خشیت اور محبت پیدا ہوتی ہے۔ لہٰذا تعلیم کے ابتدائی مراحل ہی میں متعلم کو یہ سکھانا چاہیے کہ قرآن کو ذکر بنائے اور اس کے جو مقامات سیکھے اور یاد کرے، انہیں نمازوں میں دہرائے۔ صرف اتنی چیز کی پابندی کر لینے سے طالب علم کی ذہنی اور نفسیاتی سطح قرآن کے تابع ہو جائے گی۔ ایسا ہو گیا تو اگلے مدارجِ تعلیم ایک تو زیادہ آسان ہو جائیں گے اور دوسرے علم کا دینی مقصود یعنی اس کا حال اور عمل میں ڈھلنا میسر آ جائے گا۔ اس طریقے کی، مثال کے طور پر، عملی صورت اس طرح کی

ہوگی: طالب علم نے سورۂ فاتحہ پڑھنی سیکھ لی، اب وہ ترجمہ بھی سیکھ جائے تو پھر اسے کہا جائے کہ نماز میں سورۂ فاتحہ کو اس طرح پڑھنے کی مشق کرے کہ مفہوم پر سے توجہ نہ ہٹنے پائے اور اس کے ساتھ ساتھ نماز کے علاوہ بھی سورۂ فاتحہ کو اس کے مفہوم پر دھیان کر کے ذکر اور دعاء کی نیت سے پڑھنے کی عادت ڈالے۔ اس مرحلے سے کامیابی سے گزرنے کے بعد اسے اس طرف متوجہ کیا جائے کہ اس سورہ کی وہ باتیں جو نفسِ بندگی سے متعلق ہیں انہیں اپنے اندر پیدا کرنے کی کوشش کرے۔ پورا قرآن اسی طرح پڑھایا جانا چاہیے۔ قوی امید ہے کہ اس میں ایک سال سے زیادہ وقت نہیں لگے گا اور طالب علم اپنے پورے وجود کے ساتھ ظاہر و باطن میں اس کتاب کے رنگ میں رنگ جائے گا۔ اس کے بعد چاہے تعلیم کا سلسلہ جاری نہ رہ سکے، تو بھی اس نے دینی علم کی روح اور مقصود کو بدرجۂ کمال حاصل کرلیا۔

بالکل یہی نہج سنت، حدیث اور سیرت کے باب میں بھی اختیار کی جانی چاہیے۔ ان سے عہدہ برآ ہونے کے بعد پھر جیسی فنی تعلیم مناسب سمجھی جائے دی جاسکتی ہے۔

اس مرحلے کو مکمل کر لینے کے بعد طالب علموں کو ایک سہ ماہی یا چالیس روزہ تربیتی پروگرام سے لازماً گزارا جائے۔ اس پروگرام کے ضروری اجزاء یہ ہونے چاہئیں:

- تصحیح عقائد
- تصحیح نیت
- تصحیح اخلاق
- تصحیح اعمال

یہ چاروں اجزاء ضروری نہیں ہے کہ یکے بعد دیگرے سامنے لائے جائیں۔ ان کی کوئی ترتیب بھی لازمی نہیں ہے۔ مقصود یہ ہے کہ دین ہمارے اندر ان چار سطحوں پر مکمل ہوتا ہے۔ انہیں فوری صورتِ حال کے مطابق مؤثر طریقے سے بروئے عمل لانا اہل مدارس کی بڑی ذمہ داری ہے۔ اس کا مجمل خاکہ اس طرح ہوگا:

- توحید اور دیگر بڑے عقائد کی قابل فہم اور لائق تسلیم تعلیم
- اسی کے ساتھ ساتھ ان عقائد کے ساتھ وابستگی کی صورتوں کی دریافت
- نیز ان عقیدوں سے وارد ہونے والے عبادات و اخلاق کا ضروری فہم۔
- اور پھر اس فہم پر اعمال کی استواری اور نفس کا تزکیہ۔

یہ ہیں وہ نتائج جو اس تربیتی پروگرام سے برآمد ہونے چاہئیں۔ اس پروگرام میں جو طلبہ ایک ضروری معیار تک پہنچنے میں کامیاب ہوجائیں تو انہیں اگلے تعلیمی درجات کے لیے منتخب کرنا چاہیے۔ اس پروگرام میں طالب علموں پر یہ بھی واضح ہوجانا چاہیے کہ دینی علم کیا ہے اور اس کی فضیلت کے اسباب وشواہد کیا ہوتے ہیں؟ یعنی فراغت کے بعد طالب علم کا تصورِ علم اور مقصدِ حصولِ علم فطری اور محکم انداز سے واضح ہوجانا چاہیے۔ اس کا فائدہ یہ ہوگا کہ آئندہ درجات میں وہ ٹھیٹھ فنی تعلیمات ایک درست اور محفوظ تصور کے ساتھ حاصل کریں گے جس کا پہلا نتیجہ ان شاء اللہ یہ ہوگا کہ فنون وغیرہ دینی متون پر غالب نہیں آسکیں گے جو سر دست ہمارا بڑا مسئلہ ہے۔ اس طرح علم کی ضرورت کے اور مقاصد واضح ہوجانے کے بعد بعض علوم میں غیر ضروری اشتغال کا بھی خاتمہ ہوجائے گا۔

اس تربیتی پروگرام کا آغاز اس طرح ہونا چاہیے کہ اساتذہ اور طلباء نماز حاجت پڑھ کر حصول اخلاص کی دعا کریں اور ایک دوسرے کو اپنی اس حالت پر شاہد بنائیں۔ بظاہر یہ رسمی بات معلوم ہوتی ہے لیکن اس کا ایک فائدہ ہوسکتا ہے اور وہ یہ کہ اس پروگرام میں حاضرین کے درمیان معاشرت اور ہم نشینی کے محکم اصول پہلے ہی دن طے ہوجائیں گے۔ اس طرح روحانی اور ذہنی یکسوئی کا سامان پیدا ہوسکتا ہے۔ اس صورت کو اختیار کرکے ہم دراصل دین کے دو بنیادی مطالبے پورے کرنے کی ایک ٹھوس کوشش کا عملی آغاز کریں گے۔ وہ مطالبے ہیں: صحتِ ایمان، سلامتیٔ نیت، حُسنِ عبادت اور حُسنِ اخلاق۔ اپنے مقاصد کا عملی اور زبانی اظہار کرنے کے بعد اس ترتیب کو ملحوظ رکھا جاسکتا ہے گو کہ اس کی پابندی ضروری نہیں ہے۔

جیسا کہ پہلے عرض کیا گیا کہ اس تربیتی پروگرام سے کامیابی کے ساتھ گزرے بغیر کسی طالب علم کو خواہ کتنا ہی ذہین وفہیم کیوں نہ ہو، اگلے درجے میں ترقی نہ دی جائے۔ ہمارے اکثر مذہبی نمائندوں میں اخلاق وکردار کی جو کمزوریاں عام طور پر نظر آتی ہیں ان کا غالباً ایک بڑا سبب یہی ہے کہ ان سند یافتہ لوگوں کو دینی علوم اور ان کے حقیقی مقاصد کے ساتھ اندر باہر سے وابستہ کیے بغیر انہیں فارغ التحصیل کردیا گیا۔ اس کے نتیجے میں ان کا علم بھی قابل اعتبار نہ رہا کیونکہ اس کا دارومدار محض رٹ لینے کی صلاحیت پر تھا۔ ہمارے ارباب مدارس نے اگر اس خرابی کا پوری طرح ازالہ نہ کیا تو ڈر ہے کہ مستقبل میں ان کے وجود کا کوئی دینی جواز نہیں رہ

جائے گا۔ مدارس کے مروجہ نظام تعلیم کو نصاب کی طرف سے تبدیلی کی اتنی ضرورت نہیں جتنی کہ ان کے تصور تعلیم کو ہے۔ انہیں تصورات ونظریات اوراس کی بنیاد پر بننے والے پورے ماحول کو بدلنا ہوگا۔ اس سلسلے میں ہماری تجویز یہ ہے کہ پہلے قدم پر انہیں اپنی تنظیمی اور ادارہ جاتی شناخت کو پس پشت ڈال کر مدرسے کو محض ایک عمارت اور چار دیواری تک محدود کر لینے کی بجائے دینی علم کو دعوت کے رنگ اور اسلوب میں لوگوں تک پہنچانا چاہیے اور اپنی ساری طاقت معاشرے کے ناکارہ ترین طبقے کو اپنی طرف راغب کرنے کی بجائے ایسے لوگوں کی طرف رُخ کرنا چاہیے جو دین سے کوئی مفاد عاجلہ نہیں رکھتے اور مدرسے میں داخلہ لینا ان کی معاشی یا ذہنی مجبوری نہیں ہے۔ ہر استاد کو محض کلاس تک محدود رہ کر معدودے چند طلبہ کو جن کی اکثریت کم ذہین اور بے ذوق احساسات کی مالک ہوتی ہے، دین پڑھانے کی لاحاصل کوشش کرنے کی بجائے سوسائٹی کی نسبتاً مفید، مؤثر اور زیادہ مستحق سطحوں تک خود پہنچنے کی کوشش کرنی چاہیے۔ ہمارے خیال میں مدارس کے مہتمم حضرات کا دینی فریضہ ہے کہ وہ اپنے ماتحت اساتذہ کو اس داعیانہ تعلیم وترغیب کی طرف بھی مائل کریں بلکہ ایسے آدمی کو استاد بننے کا موقع ہی نہ دیا جائے جو دعوت وتبلیغ سے مناسبت نہ رکھتا ہو۔ ہاں! جب کوئی استاد معاشرے میں مرجعیت کا درجہ لمبی کوشش کے بعد حاصل کر لے تو پھر اسے ایک جگہ پر ٹک کر بیٹھنا روا ہے۔ اس سے پہلے اِدھر اُدھر متحرک رہنا دین سکھانے اور پڑھانے والوں کی دینی ذمہ داری ہے۔

جو شخص اس بنیادی اور فطری ذمہ داری کا ادراک نہیں رکھتا وہ کسی فن کا استاد تو ہوسکتا ہے، دین کا نہیں۔ یہی ہمارے اسلاف کا طریقہ تھا اور اسی پر چل کر ہم دین کے عملی مقاصد کو اپنے بس بھر پورا کر سکتے ہیں۔ خود طلبہ کی تربیت میں بھی اس بات کو بطور خاص ملحوظ رکھنا چاہیے کہ ان میں سچی داعیانہ صلاحیتیں اور ان کو نکھارنے والا کردار پیدا ہو جائے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے اپنے دین میں ایک مستقل معجزانہ شان رکھی ہے اور وہ یہ کہ کردار کی تصدیق کے بغیر اس کی تفہیم، تعلیم اور تبلیغ مؤثر نہیں ہوسکتی۔ جو آدمی خود اسلام کی مراد پر ڈھلنے سے گریزاں ہو وہ رازیؒ وغزالیؒ جیسی علمی صلاحیت پیدا کر لے تو بھی اپنے مخاطب کو دین کی طرف سچائی اور استقامت کے ساتھ راغب نہیں کر سکتا۔ ہاں! اپنی طرح کے لوگوں کی ایک کھیپ تیار کر سکتا ہے۔ ہم مدارس کو دینی تعلیم وتبلیغ کا سر دست واحد ذریعہ سمجھتے ہیں اور یہ بھی چاہتے ہیں کہ ان کی یہ حیثیت برقرار

رہے۔ اس لیے پورے اخلاص کے ساتھ، جو ممکن ہے اظہار میں تلخ ہو، یہ عرض کرنے پر مجبور ہیں کہ مدارس کا موجودہ نظام شروع سے آخر تک محتاج اصلاح بلکہ متقضیٔ انقلاب ہے۔ اس ضرورت سے چشم پوشی وہی کرسکتا ہے جو دین کے ساتھ مخلص نہ ہو۔

دوسری ضرورت یہ ہے کہ مدارس سے بننے والا مذہبی ذہن جدید دنیا کے معاملات اور مسائل سے قریب قریب ناواقف ہے۔ اگر کہیں دخل دیتا بھی ہے تو اس کے مفید نتائج برآمد نہیں ہوتے ہیں۔ اس کمی کی وجہ سے اسلام کی وہ دعوتی قوت کمزور پڑتی جارہی ہے جو منکرین کو بھی انہی کے معیار پر قائل کردیا کرتی تھی اور جو اپنے مخاطبین میں یہ یقین راسخ کردیتی تھی کہ ایمانی ذہن انسانوں کی بدلتی ہوئی صورتِ حال کے کسی بھی مظہر سے ناواقف اور لاتعلق نہیں ہوتا۔ حقیقی مذہبی ذہن اپنے عصری مزاج اور منطق کو بھی اپنے تابع رکھنے کی قدرت رکھتا ہے۔ وہ عالم صحیح معنوں میں عالم کہلانے کا مستحق نہیں ہے جو اس نظام استدلال سے واقف نہ ہو جو قرآن وحدیث کی برکت سے دین دار اذہان میں خودبخود پیدا ہوجاتا ہے اور اسلام کے فکری وعملی غلبے کا ایک ذریعہ بن جاتا ہے۔

دنیائے جدید کا مزاج یہ ہے کہ لوگ ہر دعوے کو سب سے پہلے دو بنیادوں پر پرکھتے ہیں، عقل اور افادیت۔ آج کا آدمی دین کی طرف جانے کا سرسری سا ارادہ بھی نہیں کرے گا جب تک اس پر یہ واضح نہ ہو کہ یہ دین میرے ذہنی اشکالات کو حل کرسکتا ہے اور اس سے وابستگی دنیا میں بھی آگے بڑھا سکتی ہے یعنی دنیاوی طور پر مفید ہونا اور عقلی مسلمات سے متصادم نہ ہونا جدید دنیا کا وہ مستقل مطالبہ ہے جو وہ ہر دین سے کرتی ہے۔ اس بحث میں جائے بغیر کہ ان مطالبات کی واقعی حیثیت کیا ہے، ہم بہرحال اس سے متعلق رہنے پر مجبور ہیں۔ اگر ہم نے اسے درست بنیادوں پر بھی نظرانداز کردیا تو ہم دین کو دنیا میں اجنبی ہوجانے سے روک نہیں سکتے۔ اس صورتِ حال کا پورا ادراک ہونا چاہیے اور جیسا کہ امام ابن تیمیہؒ یا امام غزالیؒ نے کرکے دکھایا کہ منطق وفلسفے کا اثر توڑنے کے لیے پہلے ان پر، انہی کی نہج پر چل کر، حاوی ہونا پڑتا ہے۔ مقام افسوس ہے کہ اس وقت عالم اسلام میں مدارس سے نکلے ہوئے اکثر عالم جدید افکار ومسائل سے ذرا بھی قابل اعتبار واقفیت نہیں رکھتے۔ اس کے بعد جب ان مسائل پر فقہی اور واعظانہ انداز سے کوئی حکم لگایا جاتا ہے تو مخالفین کو مذاق اڑانے کا موقع مل جاتا ہے۔

حاصلِ مدعا یہ ہے کہ دینی تعلیم کا کوئی بھی نظام اپنے زمانے پر غالب آنے کے لیے درکار علوم وفنون کو نظر انداز کر کے نہیں بنایا جاسکتا۔ ایسا کرنے سے دنیاوی تو دنیاوی بعض بڑی دینی ضروریات بھی فوت ہوجاتی ہیں۔اس پہلو سے بھی مذہبی تعلیم کے موجودہ نظام میں بعض بنیادی تبدیلیوں کی ضرورت ہے۔

عصری علوم اور ان کے صحیح وغلط کے بارے میں ایک بصیرت حاصل کرنا اگر دینی ضرورت نہیں ہے تو پھر نعوذ باللہ دین انسانوں کے لیے نہیں اترا۔ بندگی جس مطلق تسلیم کا نام ہے وہ بھلا کیسے میسر آئے گی جب تک میرے ماحول سے بننے والا میرا ذہن بھی دین کے تابع نہیں ہوجاتا۔ اس سلسلے میں ہماری تجویز یہ ہے کہ درجۂ وسطانی میں طلبہ کو انگریزی زبان سکھائی جائے اور پھر اس درجے کی تکمیل کر لینے کے بعد کم از کم ایک سال کے لیے ہر طالب علم کو موجودہ دنیا کی تشکیل کرنے والا کوئی علم، اس کی صلاحیت اور میلان کو دیکھ کر، بہت اچھی طرح پڑھایا جائے۔ پھر درجۂ نہائی کی تکمیل کے بعد ہر طالب علم کے ماقابل حاصل کردہ جدید علم کو اس سطح پر پہنچانے کی کوشش کی جائے جہاں وہ اس علم میں ایک ناقدانہ رسوخ بھی پیدا کر سکے۔ بعد ازاں درجۂ تخصص کے آخری مرحلے کے طور پر طالب علم کو تقابل ادیان اور اسلام کی حقانیت کے بارے میں اس نظام استدلال کی تشکیل پر مقدر کیا جائے جو جدید منطق کے لیے نامانوس نہ ہو اور اس کی حسب ضرورت تردید کی بھی صلاحیت رکھتا ہو۔ اس کی صورتِ یہ ہوسکتی ہے کہ طالب علم کو سند تخصص اس وقت تک نہ دی جائے جب تک وہ مندرجہ بالا موضوعات پر کوئی تحقیقی کام مکمل کر کے پیش نہ کر دے۔

ہمارے مدارس کی ایک اچھی بات یہ ہے کہ ان سے فارغ التحصیل ہونے والے طلبہ کی اکثریت کسی نہ کسی انداز سے اپنے اپنے مدرسے سے متعلق ضرور رہتی ہے۔ ہمارے خیال میں یہ مدارس کی بہت بڑی قوت ہے۔ اگر اس کا صحیح مصرف نکال لیا جائے تو دین سوسائٹی کی واحد اساس بن سکتا ہے۔ اور یہ کامیابی نہایت فطری انداز سے حاصل کی جاسکتی ہے۔ اس کا طریقہ یہ ہے کہ ہر مدرسے کو مذکورہ بالا نظام تعلیم سے فارغ ہونے والے علماء کی عملی جدوجہد کا میدان خود تجویز کرنا چاہیے۔ اس سلسلے میں یقیناً بڑے وسائل درکار ہوں گے مگر مدرسوں کے اہل اہتمام وسائل کے حصول کا خصوصی ملکہ رکھتے ہیں۔ وہ یہ وسائل بھی پیدا کر سکتے ہیں، بس

عمارت سازی وغیرہ کا شوق چھوڑ دیں جس پر بڑے اخراجات اٹھتے ہیں اور جن کا خاصا حصہ غیر ضروری ہوتا ہے۔ ان فارغ التحصیل علماء کے لیے وسائل اس لیے درکار ہیں کہ ان کی معاشی فراغت کا سامان کر کے انہیں اپنے اپنے اختصاص کے مطابق میدان عمل میں اتار دیا جائے۔ ظاہر ہے یہ کام ریاست کبھی نہیں کرے گی۔ جو کرنا ہے انہی لوگوں اور انہی اداروں کو کرنا ہے۔ ہمیں یقین ہے کہ اگر مدارس اس مابعد تعلیم ذمہ داری کو اٹھالیں تو اسے نبھانا ان کے لیے زیادہ مشکل نہیں ہوگا اور اس کے کم سے کم نتائج بھی معاشرے میں مدارس کی ایسی افادیت ثابت کر دیں گے جس کا ظہور پہلے کبھی نہیں ہوا۔

ڈاکٹر محمد امین صاحب کی فکر اپنی بناوٹ میں فلسفیانہ نہیں ہے لیکن مقاصد اور معانی کے اعتبار سے اس کی وقعت اور حیثیت ایک خاص مفہوم میں فلسفیانہ شعور اور ذوق کے مطالبات پورے کرتی ہے۔ ہمارے ساتھ مسئلہ یہ ہے کہ ہم نے جدید تعلیم اور اس کے پورے نظام کو قبول تو کرلیا لیکن اپنی زندگی اور اس کے مستقل مقاصد کے ساتھ اس کی تطبیق میں مکمل طور پر ناکام رہ گئے۔ اس وجہ سے ذہن، خیال اور طرز احساس کی تمام سطحوں پر ہم ایک دولختی میں مبتلا ہیں۔ ہمارے تعلیمی حاصلات اور مقاصد ہمارے اس شعور میں گہرائی تک رسائی نہیں رکھتے جو زندگی میں معنویت پیدا کرتا ہے اور آدمی کو اس میکانکی سطح پر محدود نہیں رہنے دیتا۔ آخر کیا وجہ ہے کہ ایک صدی سے زیادہ عرصے کو محیط نظام تعلیم ہمارے اندر وہ نتائج بھی پیدا نہیں کر سکا جو کسی بھی تعلیمی نظام کے فطری اور فوری لوازم میں سے ہیں یعنی ان نتائج کا ظہور خود بخود ہوجاتا ہے۔ مثال کے طور پر یہی دیکھ لیں کہ ہم آج تک جدید علوم کے کسی معمولی سے معمولی شعبے میں بھی کوئی ایسا کردار ادا نہیں کر سکے جو اس شعبے میں کسی نئے پہلو کا اضافہ کرتا۔ ظاہر ہے کہ تعلیم خصوصاً ایک نظام کی حیثیت سے انسان کے مجموعی شعور کا اقتضا ہوتی ہے۔ ہمارے لیے وہ تمام علوم غیر مطلوب ہیں جو ہمارے مجموعی شعور سے ہم آہنگ نہیں ہیں اور ہمارے مقاصد علم سے مطابقت نہیں رکھتے۔ ہم نے بے بصیرتی کا مظاہرہ کرتے ہوئے اپنے موجود ہونے کی ایک بڑی بنیاد کو ایک بالکل مختلف بلکہ متصادم پس منظر رکھنے والے تمدن سے اُخذ کیا۔ چونکہ آدمی کو بنانے یا بگاڑنے والی اکثر صورتیں معمول کے ارادہ وشعور کی گرفت سے بلند ہوتی ہیں اس لیے ہمیں آج بھی اس بات کا ادراک کرنے میں دقت محسوس ہوتی ہے کہ تعلیم کے جدید نظامات وتصورات نے ہمیں وہ نہیں رہنے دیا جو ہم تھے یا جیسا ہمیں ہونا چاہیے تھا۔ اوپر سے مروجہ

تعلیم نے اپنا ناگزیر ہونا جن دلائل کی بنیاد پر ہم سے منوا رکھا ہے ان دلائل کی طرف ملتفت ہونے کے لیے بھی ایک خاص نوع کی پستی درکار رہے۔ دینی تہذیب اپنی نچلی سطحوں پر بھی دنیا کو کسی بھی عنوان سے علم کا مقصود اعظم نہیں بننے دیتی۔ یہ امر مسلمانوں کی فطرت کا جوہر ہے کہ ان کے تمام مقاصد، خواہ وہ علمی ہوں یا عقلی، دنیا سے واسطہ تو رکھتے ہیں مگر اس میں صَرف نہیں ہو جاتے جب کہ دوسری طرف وہ تصور تعلیم جو ہمارے اندر پوری طرح مروج ہو چکا ہے، دنیا سے اوپر اٹھنے کے کسی بھی تصور کو بے معنی گردانتا ہے۔ یہ ہے وہ اندرونی تضاد جس نے ہمیں نہ اِدھر کا رکھا نہ اُدھر کا۔

مذہبی فکر کے موجودہ مظاہر اس ضرورت کی طرف پوری طرح متوجہ نہیں ہیں کہ مسلمانوں میں انفرادی یا اجتماعی تبدیلی پیدا کرنے کا کوئی عمل موجودہ نظام تعلیم کی مکمل تبدیلی کے بغیر ممکن نہیں ہے۔ یہ بات سمجھنے اور جاننے کے لیے کسی بڑے ذہن کی ضرورت نہیں ہے کہ آدمی کی تشکیل میں سب سے زیادہ اثر اس تعلیم کا ہوتا ہے جو اسے میسر آتی ہے۔ یہ اثر عقائد و نظریات سے بھی بڑھ کر ہوتا ہے کیونکہ تعلیم کا عمل ذہن کو ذوق بنا دیتا ہے اور کسی خاص اسلوب تعلیم سے پیدا ہونے والی ذہنیت اور ذوق اپنے حامل کے ان نظریات کو بھی اپنے رنگ میں رنگ لیتی ہے جو خود اس طریق تعلیم کی دین نہیں ہوتے۔ اسی لیے جدید تعلیم یافتہ لوگوں کے خالص دینی تصورات بھی دیگر اہل دین کے مقابلے میں صورتاً ہی نہیں بلکہ حقیقتاً مختلف ہوتے ہیں۔ ان کا خدا اور ہے، ان کا قرآن اور ہے....

اس صورتِ حال میں ڈاکٹر محمد امین صاحب نے بالکل درست بنیادوں پر یہ منصوبہ بنایا کہ دنیاوی اور دینی تعلیم کے مروجہ نظامات اور اداروں کو اس نقطۂ نظر سے دیکھا جائے کہ ان سے مسلمانوں کی حقیقی ضروریات کس حد تک پوری ہو رہی ہیں اور کہاں تک مجروح ہو چکی ہیں۔ اس منصوبے میں چونکہ نتائج کا حصول محض نظریئے سازی سے بڑھ کر مطلوب ہے لہٰذا ڈاکٹر صاحب نے اس کے علمی اور عملی حصوں کو آپس میں ممتاز رکھنے کے باوجود خود کو ممکن العمل تصورات تک محدود رکھا ہے اور ان تصورات کے بیان کو، علمی سطح سے فروغ تر ہوئے بغیر، سادہ اور عام فہم رکھا ہے۔ ہمارے ذہنوں میں علمیت اور مشکل پسندی لازم و ملزوم کی حیثیت اختیار کر گئے ہیں۔ اس لیے ممکن ہے کہ بادی النظر میں ان کا اسلوب گہرا اور فلسفیانہ معنی میں دقیق

اور پرشکوہ محسوس نہ ہو لیکن جن لوگوں کو علم اور اس کے مقصود سے سچی مناسبت میسر ہے وہ جانتے ہیں کہ علم کا سب سے بڑا ہدف معلوم کو موجود کر دکھانا ہے اور ایسا اس وقت تک ممکن نہیں جب تک ہم نظریئے کو عمل میں ڈھلنے کی راہ نہ فراہم کریں۔ ڈاکٹر صاحب نے اپنے اسلوب اور موضوعات میں اسی چیز کی رعایت رکھی ہے۔ بظاہر سادہ نظر آنے والی باتیں بھی معنی خیزی کی بلند ذہنی سطحوں کو محیط ہیں بشرطیکہ پڑھنے والا واقعی ایک علمی ذہن رکھتا ہو اور یہ جانتا ہو کہ علمیت کا تعلق الفاظ سے نہیں بلکہ ان معانی سے ہے جو انسان کے عملی وجود کی تکمیل کرتے ہیں۔ مجھے ان تحریروں میں یہ بات خاص طور پر پسند ہے کہ ان کا قاری مصنف کی طرف متوجہ ہونے کی بجائے پیغام کی طرف کھنچتا ہے اور خود پیغام کا بیان اس طرح ہوتا ہے کہ زیادہ تر لوگ اپنی کسی علمی مجبوری کی وجہ سے اس کے کسی ضروری حصے سے محروم نہیں رہتے۔ جو حضرات مذہبی شعور کے دروبست سے واقف ہیں وہی اس خوبی کی تحسین کر سکتے ہیں۔

مذہبی شعور محض تصور سازی کو قبول نہیں کرتا، اس کا بنیادی میلان تصدیق کی طرف ہوتا ہے۔ واقعیت سے عاری تصورات اور عمل سے منقطع نظریات مذہبی شعور کا موضوع نہیں ہیں۔ ویسے بھی تصور محض فلسفے کی رو سے بھی علم کہلانے کا مستحق نہیں ہے اور یہ غیر ترتیب یافتہ دماغ کی وہ فعلیت ہے جو وہ علم کی ذمے داری سے بچنے کے لیے بروئے کار لاتا ہے۔ اس بات میں کسے شعبہ ہو سکتا ہے کہ چیزوں میں نامعلومیت کے عنصر کو ابھارنا اور انہیں مزید پھیلانا، انسان کی بنیادی ضرورت علم کے خلاف ہے۔ ڈاکٹر امین صاحب استدلال کو طول دینے کی بجائے نتائج استدلال کو محکم اور سہل انداز سے بیان کر کے اخلاقی اور عملی زندگی کے ثابت شدہ پھیلاؤ میں ان کی جگہ بنا کر دکھاتے ہیں۔ بالفاظ دیگر سیڑھی پر زیادہ وقت صَرف کرنے سے بچ کر چھت تک پہنچنے کو اپنا ہدف بناتے ہیں اور وہاں پہنچ کر اس رسائی کی پوری سرگزاشت نہیں سناتے بلکہ اس سے میسر آنے والی چیزوں کا ایسا تعارف کرواتے ہیں جس سے ان کی افادیت اور مقصودیت کا جوہر کسی غیر ضروری تفصیل کی نذر نہیں ہوتا۔

ڈاکٹر محمد امین صاحب تعلیم کے موضوع پر یقیناً نظریہ سازی سے بھی کام لیتے ہیں لیکن بنیادی طور پر ان کا اصل موضوع امت کا احیاء ہے۔ چونکہ ان کی نظر میں تعلیم اس مطلوبہ احیاء میں سب سے بنیادی کردار ادا کر سکتی ہے لہٰذا انہیں اس میدان میں بھی ایک تھیوری بنانے کی

ضرورت پیش آئی۔ اس تھیوری کے بنیادی اجزاء یہ ہیں:

۱۔ تعلیم کا نظام مقاصد تخلیق نہیں کرتا بلکہ ان کے تابع ہوتا ہے۔

۲۔ نظام تعلیم کو طریقوں کے فرق کے باوجود واحد المقصد ہونا چاہیے یعنی تعلیم چاہے دنیاوی ہو یا دینی ان کی شخصیت سازی کا منہاج ایک ہونا چاہیے۔ کالجوں اور مدرسوں کے طلبہ کی شخصیت کے بنیادی عناصر یک رنگ ہونے چاہئیں۔

۳۔ تعلیم کے دو لازمی نتائج ہوتے ہیں: کردار اور اہلیت۔ کردار ایک ہوتا ہے اور اہلیتیں زندگی کی مختلف ضرورتوں کے اعتبار سے مختلف۔ یعنی ہر قسم کی تعلیم کے اخلاقی نتائج یکساں ہوں گے اور عملی نتائج متنوع۔

۴۔ تعلیم اس وقت تک بے معنی اور بے سود ہے جب تک وہ ہمیں چیزوں کو دیکھنے کا درست انداز نہیں سکھاتی۔ چیزوں کو جان لینا مقصود نہیں ہے بلکہ انہیں اپنے تصور زندگی میں کار آمد بنانا مقصود ہے۔ اس کے لیے ہمیں اپنی اس پوزیشن کا مستقل شعور درکار ہے جہاں کھڑے ہو کر ہمیں چیزوں کا مطالعہ کرنا چاہیے۔ اگر کوئی علم ہمیں یہ شعور نہیں دیتا تو وہ ہمارے لیے ذہن کی ایک غیر ضروری ورزش ہے۔

۵۔ تعلیم کا کوئی بھی تصور تربیت کے بغیر ناقص بلکہ مضر ہے کیونکہ اس کے نتیجے میں اہلیت تو پیدا ہو جائے گی مگر کردار نہیں۔ کردار پشت پر نہ ہو تو اہلیت ایک خطرناک چیز ہے۔

۶۔ تعلیم انسانی شعور کی تمام سطحوں کا احاطہ کرتی ہے۔ ان سطحوں میں اخلاقی شعور کو مرکزیت حاصل ہے۔ جو نظام تعلیم اس مرکزیت کو ملحوظ نہیں رکھے گا وہ ہماری انفرادی اور اجتماعی دونوں بنیادوں کو منہدم کر دے گا۔

۷۔ وہ نظام تعلیم بھی ناقص ہے جو ہماری دنیاوی ضروریات کو پورا نہ کر سکے۔

۸۔ مسلمانوں میں علم ذہن کی اس صلاحیت کو کہتے ہیں جو ایمان میں رسوخ اور ترقی کے لیے درکار ہے مثلاً فزکس اور معاشیات وغیرہ کو بھی ہمارے ایمانی شعور میں اضافے اور مضبوطی کا ذریعہ بننا چاہیے ورنہ یہ بے مصرف ہیں۔ اس اصول پر کسی بھی حال میں سمجھوتہ نہیں کرنا چاہیے۔

(بقیہ صفحہ نمبر: ۳۷)

تعلیم و تربیت پروفیسر ملک محمد حسین

تعلیمی دہشت گردی

تعلیمی دہشت گردی کی اصطلاح بظاہر بڑی عجیب معلوم ہوتی ہے لیکن اسلامی دنیا میں عموماً اور پاکستان میں خصوصاً تعلیمی دہشت گردی ایک حقیقی مسئلہ ہے۔ تفصیل اس اجمال کی یہ ہے کہ تعلیمی پالیسیوں میں پبلک اور پرائیویٹ تعلیمی اداروں میں ایسے اقدامات کیے جا رہے ہیں جو عامۃ الناس کی ضروریات، امنگوں اور تصورات کے بالکل منافی ہیں۔ ان پالیسیوں کی نہ تو ملک کا آئین اجازت دیتا ہے اور نہ ملک کا بنیادی نظریہ۔ معاشرے کی روایات اور ضروریات کے بالکل برعکس تعلیمی فیصلے ریاستی اور سرمائے کی قوت سے ٹھونسے جا رہے ہیں۔ نام عوامی مفاد کا لیا جاتا ہے لیکن عمل سراسر عوامی مفاد کے خلاف ہوتا ہے۔ ہم عمران خان کی نیت اور جذبے پر شک نہیں کرتے، ہم ان کی تعلیمی بیوروکریسی پر بھی خاکم بدہن تعلیم دشمنی کا الزام نہیں دھرتے لیکن اسے کم عقلی پر مبنی کہے بغیر بہرحال چارہ نہیں۔ ہم وزارت وفاقی تعلیم کے برزجمہروں پر تعلیم دشمنی کا الزام نہ بھی دھریں تو تعلیم کے معاملات میں ان کی مکمل جہالت کا انکار نہیں کر سکتے۔ پالیسی کے سلسلہ میں تین امور ہیں جن میں غلط فیصلے ہو رہے ہیں: ان میں ایک مخلوط تعلیم کا مسئلہ ہے دوسرا انگلش میڈیم کا مسئلہ اور تیسرا سیکولر بنیادوں پر استوار یکساں قومی نصاب کا معاملہ۔

کچھ عرصہ پہلے تک لڑکوں اور لڑکیوں میں کم از کم بارہ چودہ سال کی عمر تک جنسی ادراک، جنسی خواہشات کے مظاہر کم نظر آتے تھے لیکن اب ٹی وی چینلز، الیکٹرانک میڈیا اور سوشل میڈیا نے جنسی بھوک اور جنسی خواہشات کا ایک طوفان پیدا کر دیا ہے۔ یہ ابلاغی دہشت گردی ہے۔ بچوں کے لیے کارٹون پروگرامز تو بہت ہی کم عمر بچوں میں جنسی ادراک اور جنسی خواہشات پیدا کر رہے ہیں۔ ادھر ہماری خرد ماغ افسر شاہی اور افسروں کے ہپناٹائیز کیے ہوئے حکمرانوں نے سرکاری سکولوں میں پرائمری سطح پر مخلوط تعلیم نافذ کر دی ہے نیز سکولوں

کالجوں میں مردوزن اساتذہ کو بھی اکٹھا کردیا ہے۔ دوسری طرف پرائیویٹ تعلیمی اداروں میں ہر سطح پر مخلوط تعلیم رائج ہے اور محکمہ تعلیم آنکھیں بند کیے ہوئے ہے۔ رجسٹریشن کے وقت انٹرمیڈیٹ تک تعلیم دینے والے ہر ادارے سے حلف نامہ لیا جاتا ہے کہ ادارے میں مخلوط تعلیم نہیں ہوگی لیکن عملاً بڑے بڑے جدید دینی مالکان سکول کے تعلیمی اداروں میں بھی مخلوط تعلیم ہے۔ ذرا میڈیا کی پھیلائی ہوئی جنسی بے حیائی اور فحاشی کو نظر میں رکھیے اور پھر تعلیمی اداروں میں مخلوط تعلیم کے تباہ کن نتائج پر نگاہ ڈالیے تو کیا منظر نامہ بنتا ہے؟ اس منظر نامے کی ایک فلم لاہور گرامر سکول کے حوالے سے چل چکی ہے اور اس منظر نامے کو پانچ چھ لڑکیوں کا وہ گروہ چند سال پہلے قوم کے سامنے پیش کر چکا ہے جو راولپنڈی کے ایک تعلیمی ادارے سے گروپ کی شکل میں غائب ہوئے اور کچھ دنوں بعد پشاور کے ایک ہوٹل سے برآمد ہوئے۔ جدیدیت کے شوقین والدین کس طرح اپنی نوجوان بیٹیوں کو برقعے اوڑھا کر اور چھپا کر عدالت سے اپنے گھروں کو لے گئے وہ ہم سب نے ٹی وی پر دیکھا اور کسی کی غیرت کو ذرا سا ٹھوکا بھی نہ لگا۔

چند سال پیشتر پنجاب گروپ آف کالجز لاہور کی طالبات کے ساتھ رات گئے میوزک کنسرٹ کے اختتام پر جو واقعہ پیش آیا، کیا وہ تعلیمی دہشت گردی کا شاخسانہ نہیں تھا؟ کتنے افسوس کی بات ہے کہ تعلیمی دہشت گردی کے اس بدترین حادثے میں تین لڑکیوں کی جان گئی، درجنوں لڑکیاں زخمی ہو کر ہسپتال پہنچیں، سیکڑوں لڑکیوں کے جوتے اور سکول بیگ الحمرا کمپلیکس کے باہر لان میں بکھرے زبانِ حال سے اس روح فرسا واقعہ کی کہانی بیان کر رہے تھے لیکن قوم کا ردِّعمل کیا آیا؟ یہ کہ پنجاب گروپ آف کالجز میں انٹر کی سطح پر طلبا و طالبات کا داخلہ بڑھ گیا۔ کتنے دُکھ کی بات ہے کہ پرائیویٹ تعلیمی ادارے اپنی پبلسٹی کی خاطر اخلاقی اقدار کا سہارا لینے کی بجائے اخباروں کے فل سکیپ صفحات میوزک کنسرٹ اور ناچنے گانے کی محفلوں کی تصویریں سجاتے ہیں۔ افسوس ہے کہ جو ادارے مخلوط تعلیم سے پاک ماحول مہیا کرتے اور اخلاقی اقدار پر زور دیتے تھے وہ آہستہ آہستہ بند ہو رہے ہیں کیونکہ ٹھیٹھ دینی والدین بھی اپنے بیٹوں، بیٹیوں کو ترجیحاً انہی اداروں میں داخل کراتے ہیں جو ترقی پسندی کا علم اٹھائے ہوئے ہیں۔ یہ ایک عجیب صورتِ حال ہے کہ دین دار خاندان ترقی پسند تعلیمی اداروں کو اور دنیا دار

خاندان دینی اقدار کے حامل تعلیمی اداروں کو پسند کرتے ہیں۔افسوس کی بات یہ ہے کہ عمران خان جو ریاست مدینہ کا نعرہ بلند کیے ہوئے ہے ان کی حکومت کے عہد میں تعلیمی دہشت گردی کا ارتکاب ہو رہا ہے۔

دوسری دہشت گردی جس کا ہم نے سطور بالا میں ذکر کیا وہ انگریزی کی تعلیم اور انگریزی ذریعہ تعلیم ہے۔ ہمارے بچوں کو تعلیمی مشکلات کا شکار رکھنے، انہیں فہم و عقل سے تہی دامن رکھنے اور تنقیدی و تحقیقی سوچ سے خالی رکھنے کا اس سے بدتر اور کوئی نسخہ نہیں ہے لیکن اشرافیہ اور اشرافیہ کی نمائندہ حکومتیں انگریزی کے ذریعہ اپنی بالادستی قائم رکھنا چاہتی ہیں۔ دستور کے تقاضے، سپریم کورٹ کے فیصلے اور قوم کے متفقہ مطالبے کو پس پشت ڈالتے ہوئے انگریزی زبان کے زبردستی غلبے کی دہشت گردی اس قوم کا مقدر بنادی گئی ہے

عمران خان حکومت کی تیسری دہشت گردی وہ نصاب تعلیم ہے جو یکساں قومی نصاب کے نام پر قوم پر تھوپا جارہا ہے۔ یہ نصاب بد قسمتی سے بیرونی غلامی کا ایک شاہکار ہے جسے سیکولر ولبرل اقدار پر استوار کیا گیا ہے۔اس نصاب میں اسلامیات کا مضمون بھی شامل ہے لیکن اس کے خلاف بھی سیکولر لبرل لابی کو متحرک کردیا گیا ہے۔ بہانہ یہ ہے کہ اسلامیات کے نصاب سے اقلیتوں کے حقوق متاثر ہوتے ہیں لیکن یہ کوئی نہیں سوچتا کہ ۳ فیصد اقلیتوں کے حقوق کے نام پر ۹۷ فیصد مسلمانوں کے حقوق غصب کرنا کیسے صحیح ہے؟ اگرچہ اسلامیات کے نصاب سے اقلیتوں کے حقوق بھی غصب نہیں ہوتے کیونکہ انہیں تو اسلامیات کا نصاب پڑھنا ہی نہیں ہوتا۔ سیکولر ولبرل اقدار پر مبنی نصاب واضح طور پر تعلیمی دہشت گردی ہے۔ مسلمان بچوں کے لیے نصاب تو اسلامی اقدار پر مبنی ہونا چاہیے لیکن حکومت میں شامل تعلیمی دہشت گرد اپنے ناجائز اختیارات کے بل بوتے پر تعلیمی دہشت گردی پر تلے ہوئے ہیں۔ حکومت کے پاس اس تعلیمی دہشت گردی کا سب سے ظالم اور جان لیوا اختیار مقابلے کے امتحانات اور اعلیٰ ملازمتوں کے انٹرویوز ہیں جو انگریزی میں لیے جاتے ہیں تاکہ اردو میڈیم کے ذہین نوجوان کہیں اعلیٰ ملازمتوں میں آگے نہ آجائیں۔ اگر ہم ترقی کرنا چاہتے ہیں، اگر ہم اپنے نوجوانوں میں فہم و فراست، تنقیدی و تحقیقی صلاحیتیں اور حریت پسند سوچ پیدا کرنا چاہتے ہیں تو ہمیں تعلیمی دہشت گردی کی ہر شکل کا مقابلہ کرنا ہوگا اور اسے اپنے تعلیمی نظام سے اکھاڑ پھینکنا ہوگا۔

سیرتِ رسول۔مغرب کی گواہی

مائیکل ہارٹ نے اپنی کتاب ''سو عظیم شخصیات'' لکھنے میں 28 سال کا عرصہ لگایا اور جب اپنی تالیف کو مکمل کیا تو لندن میں ایک تقریب رونمائی منعقد کی جس میں اس نے اعلان کرنا تھا کہ تاریخ کی سب سے ''عظیم شخصیت'' کون ہے؟

جب وہ ڈائس پر آیا تو کثیر تعداد نے سیٹیوں، شور اور احتجاج کے ذریعے اس کی بات کو کاٹنا چاہا تا کہ وہ اپنی بات مکمل نہ کر سکے۔اس نے کہنا شروع کیا:

''ایک آدمی چھوٹی سی بستی مکہ میں کھڑے ہو کر لوگوں سے کہتا ہے: مَیں اللہ کا رسول ہوں۔میں اس لیے آیا ہوں تا کہ تمہارے اخلاق و عادات کو بہتر بنا سکوں، تو اس کی اس بات پر صرف چار لوگ ایمان لائے جن میں اس کی بیوی، ایک دوست اور 2 بچے تھے۔

اس بات کو 1400 سو سال گزر چکے ہیں۔مرورِ زمانہ کے ساتھ اب اس کے پیروؤں کی تعداد ڈیڑھ ارب سے تجاوز کر چکی ہے اور ہر آنے والے دن میں اس کے ماننے والوں کی تعداد میں اضافہ ہو رہا ہے۔اور یہ ممکن نہیں ہے کہ وہ شخص جھوٹا ہو کیونکہ 1400 سو سال تک جھوٹ کا زندہ رہنا محال ہے اور کسی کے لیے یہ بھی ممکن نہیں ہے کہ وہ ڈیڑھ ارب لوگوں کو دھوکہ دے سکے۔ہاں! ایک بات اور۔

اتنا طویل زمانہ گزرنے کے بعد آج بھی لاکھوں لوگ ہمہ وقت اس کی ناموس کی خاطر اپنی جان تک قربان کرنے کے لیے مستعد رہتے ہیں۔کیا ہے کوئی ایک بھی ایسا مسیحی یا یہودی جو اپنے نبی کے ناموس کی خاطر جان دینے کو تیار ہو؟

بلاشبہ تاریخ کی وہ عظیم شخصیت محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) ہیں۔''

ہارٹ کی اس تقریر پر پورے ہال میں اس عظیم شخصیت اور سید البشر صلی اللہ علیہ وسلم کے ذکر کی ہیبت اور جلال کی وجہ سے خاموشی چھا گئی۔

اسلام اور پاکستان ڈاکٹر محمد امین

پاکستان میں غلبۂ دین کیسے ممکن ہے؟

ماہنامہ 'حکمت بالغہ' جھنگ کی تجاویز پر چند گزارشات

۱۔ ہمارے دوست اور بھائی ماہنامہ 'حکمت بالغہ' کے مدیر انجینئر مختار فاروقی صاحب کمال کے آدمی ہیں۔ جوانی میں دورانِ ملازمت انجینئر رہے ہوں گے اب تو بہر حال لکھاری ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے ان کو رواں قلم عطا فرمایا ہے۔ نظریات رکھتے ہیں اور ان کے لیے قلم سے جہاد کرنے کا جذبہ فراواں بھی، لہٰذا ہر چند ماہ بعد حکمت بالغہ کا ایک ضخیم نمبر اپنے قارئین کو مہیا کر دیتے ہیں۔ یوں وہ ان جرائد نما کتابوں کے مصنف و مرتب بھی ہیں۔

۲۔ دین کے اہم موضوعات جیسے خدمتِ قرآن، اشاعتِ اسلام، خواہش غلبۂ دین، ردّ مغرب وغیرہ ہمارے اور ان کے مشترکات ہیں۔ جہاں تک پاکستان میں غلبۂ اسلام کی حکمت عملی کا تعلق ہے، ہماری رائے ان سے مختلف ہے۔ تاہم یہ علمی و فکری اختلاف ہمارے مابین محبت کو کم نہیں کرتا چنانچہ جن لوگوں کو اس موضوع سے دلچسپی ہے وہ ہماری ان گزارشات کو ان پر تنقید و محاکمہ سمجھنے کی بجائے تبادلۂ خیال کی مجلس سمجھیں اور دونوں نقطۂ ہائے نظر پر غور کریں۔

۳۔ وہ اکثر اقبال کو اپنے اظہار کا ذریعہ بناتے اور انہیں ماڈل بنا کر پیش کرتے ہیں۔ یوں انہیں اس کی فکری فروگزاشتوں کا بوجھ اٹھانا بھی خوبصورت لگتا ہے جبکہ ہمیں نہیں لگتا۔ چلیے ڈاکٹر اسرار احمد مرحوم کی طرح اسے ان کی انفرادیت سمجھیے۔

۴۔ ۳۹۴ صفحات کے اس شمارے میں، جس کا عنوان انہوں نے ''اقبال و جناح کے پاکستان کا استحکام و بقا۔ فکرِ اقبال کی روشنی میں چند عملی اقدامات'' رکھا ہے [طویل عنوان سے گھبرایئے نہیں۔ بعض اوقات مصنف کو مختصر عنوان نہیں سوجھتا یا وہ اسے مخل فہم سمجھ کر 'ابلاغ' کو 'ادبیت' پر فوقیت دینا مناسب سمجھتا ہے) اور اس کے آخر میں حاصلِ مطالعہ کے طور پر انہوں

نے پاکستان میں غلبۂ اسلام کے لیے جو تجاویز پیش کی ہیں ان کا خلاصہ یہ ہے:(۱)

* مسلکی تنظیمیں، اصلاحی تحریکیں اور دینی سیاسی جماعتیں سب پاکستان میں نفاذ شریعت کے لیے جمع، متحد اور متحرک ہو جائیں۔ سوادِ اعظم یعنی حنفی بریلوی مسلک کے علماء اس کی ابتداء کریں۔

۱۔ ۳۱ علماء کے متفقہ ۲۲ نکات کے تناظر میں ملک میں ریفریڈم کرایا جائے کہ کیا لوگ پاکستان میں نفاذ اسلام چاہتے ہیں؟

۱.۱۔ اگر جواب ہاں میں ہو تو تین سال کے لیے ایک مجلس آئین ساز تشکیل دی جائے جو:
i۔ دینی مدارس کے فارغ التحصیل طلبہ کو قانون اور قانون کے طلبہ کو دین سکھانے کا انتظام کرے۔ ii۔ آئندہ اسمبلیوں میں یہی لوگ رکن بن سکیں گے۔ iii۔ یہ مجلس نفاذ اسلام کے حوالے سے سیاسی، معاشی اور سماجی حوالے سے بنیادی فیصلے کرے۔ iv۔ پبلک لاء حنفی ہوگا البتہ پرسنل لاء ہر مسلک کا اپنا ہوگا۔ v۔ نظام تعلیم کو اسلامی بنایا جائے گا۔

* اگر مندرجہ بالا تجاویز پر عمل ممکن نہ ہو تو متبادل تجاویز یہ ہیں:

۲۔ سارے مسالک کے علماء مل کر طے کر لیں کہ پبلک لاء حنفی ہوگا اور پرسنل لاء ہر مسلک کا اپنا۔

۱.۲۔ سپریم کورٹ کا ایک بنچ، جس کے ججوں کا معیار طے ہو، اگر علماء وفقہاء کی رائے سن کر کسی قانون کو خلاف شریعت قرار دے تو اسمبلی اس کو بدل کر نیا مطابقِ اسلام قانون بنائے۔

ان تجاویز پر ہماری گزارشات حسب ذیل ہیں۔ پہلے ہم بنیادی فکری مباحث کو لیں گے اور پھر انتظامی وسیاسی اقدامات کو۔

---

(۱) تفصیل کے لیے دیکھیے حکمت بالغہ کے خصوصی شمارے (نومبر ۲۰۲۰ء) کا صفحہ ۳۶۸ تا ۳۴۷۔ شمارہ آن لائن www.hikmatbaalgaha.com پر ملاحظہ کیا جاسکتا ہے یا قرآن اکیڈمی، لالہ زار کالونی نمبر ۲، ٹوبہ روڈ جھنگ صدر (فون 0336-6775861) سے طلب کیا جاسکتا ہے۔

۱۔ دین اور غلبۂ دین کا یہ تصور ہمارے نزدیک، شرعی و عقلی دونوں لحاظ سے صحیح نہیں ہے (اور بعض کے نزدیک گمراہ کن ہے) کہ اسلامی اصولوں پر فرد کی تعمیر اور معاشرے کی تشکیل کیے بغیر محض ریاست و حکومت میں قانون اسلامی بنا دینے سے معاشرے میں دین غالب آجاتا ہے۔ اس کی شرعی بنیادیں دو ہیں: ایک یہ کہ اللہ تعالیٰ کو انسانوں میں یعنی ان کی انفرادی اور اجتماعی زندگی میں، جو تبدیلی لانی مقصود تھی اس کے لیے انہوں نے جو طریقہ اپنے پیغمبر کو بتایا وہ ''تلاوت و تعلیم کتاب، تعلیم حکمت اور تزکیۂ نفس'' تھا۔ یہ بات قرآن حکیم میں اللہ تعالیٰ نے چار دفعہ فرمائی[۱]۔

دوسرے یہ کہ ہمارے سامنے پیغمبر علیہ الصلاۃ والسلام کا اسوۂ یہی ہے، اور ہم آپ کے اسوۂ کی پیروی ہی کے مکلف ہیں[۲] کہ آپ نے اللہ تعالیٰ کی براہ راست رہنمائی میں مکہ میں تیرہ سال تک تعمیر فرد کا کام کیا۔ پھر اللہ تعالیٰ نے اپنی مشیت سے اہل مدینہ کے دل کھولے، تو وہاں بھی آپ نے یہی کام جاری رکھا اور بتدریج وہاں اسلامی معاشرہ قائم کیا اور اس کے بعد اور اس کے نتیجے میں وہاں اسلامی حکومت قائم کی۔ اگر محض حکومت اور قانون کی طاقت ہی مطلوب ہوتی تو آپ کو اس کی پیشکش تو قریش نے ابتدائے دعوت ہی میں حضرت ابو طالب کی حیات میں مکہ ہی میں کر دی تھی۔ آپ اقتدار لے لیتے اور اس میں حکمت و تدریج سے اسلامی قوانین نافذ کر دیتے، ۲۳ سالہ جانگسل جدوجہد کی ضرورت ہی نہ تھی لیکن ریکارڈ گواہ ہے کہ آپ نے اسے قبول نہیں فرمایا۔

اس کے عقلی دلائل بھی دو ہیں: ایک یہ کہ ریاست و حکومت اور معاشرہ افراد ہی سے مل کر بنتا ہے۔ عقل میں یہ بات نہیں آتی کہ فرد میں جو تبدیلی نہ آئے یا فرد جس تبدیلی کو قبول کرنے پر آمادہ نہ ہو وہ معاشرے اور ریاست میں کیسے آسکتی ہے اور اس کے ذریعے کیسے آسکتی ہے؟ آپ موجودہ پولیس، وکلاء، عدلیہ، بیوروکریسی، فوج، سیاستدانوں کے ذریعے اور ان کے ہوئے ہوئے پاکستان میں اسلام نافذ کر سکتے ہیں؟ کیسے کر سکتے ہیں جب وہ اس کے قائل اور حامی ہی نہیں! کیا الجزائر، مصر، فلسطین بلکہ خود پاکستان میں ضیاء الحق کے تجربے کی ناکامی کے

---

[۱] البقرہ ۲: ۱۲۹، البقرہ ۲: ۱۵۱، آل عمران ۳: ۱۶۴، الجمعہ ۶۲: ۲

[۲] الحشر ۵۹: ۷

بعد بھی دلائل کی ضرورت ہے؟

دوسرے یہ کہ ہم سب کا مشاہدہ یہی ہے۔ پاکستان میں دستوری لحاظ سے حدود قوانین ۱۹۷۹ء سے نافذ ہیں۔ کیا کسی شرابی کو آج تک کوڑے لگے ہیں؟ کسی چور کا ہاتھ کٹا ہے؟ کسی زانی کو رجم کیا گیا ہے؟ کیوں ایسا نہیں ہوا؟ اسلامی قانون تو موجود ہے! دراصل یہ تھیسز ہی غلط ہے کہ قانون اسلامی ہو جائے تو دین غالب آ جائے گا۔

قرآنی اصطلاح میں دین کے اظہار اور اس کی اقامت یا ہماری آج کی اصطلاحات میں غلبہٗ دین، نفاذ شریعت، نظام مصطفیٰ، اسلامی انقلاب وغیرہ کا صحیح شرعی طریقہ یہ ہے کہ پہلے فرد پر محنت کی جائے، دین کا صحیح اور جامع تصور اس کے قلب میں اتارا جائے، اس پر عمل کے لیے اس کی تربیت کی جائے (تعلیم کتاب وحکمت وتزکیۂ نفس کے ذریعے) یہاں تک کہ وہ اس تبدیلی کو اپنی خوشی ورضا سے قبول کر لے بلکہ یہ اس کی خوشی اور رضا بن جائے۔ وہ نہ صرف خود دین پر عمل کرے بلکہ اس پر عمل کا علمبردار بن جائے۔ اس کے نتیجے میں یہی افراد اسلامی معاشرہ بھی قائم کرلیں گے اور اسلامی ریاست بھی وجود میں لے آئیں گے۔

۲۔ آپ جب تک کلمہ طیبہ کے پہلے جزء لَآ اِلٰهَ پر عمل کر کے اسلام مخالف مغرب کی ملحدانہ مغربی فکر وتہذیب اور اس کے نظریات اور اداروں کو، جو درحقیقت دین ماسوی اللہ ہیں، شعوری طور پر ردّ نہیں کرتے اور ان کی جگہ قرآن وسنت، امت کے چودہ سو سالہ تجربات اور عصری ضرورتوں کو پیش نظر رکھتے ہوئے اجتہاد نہیں کرتے اور اپنے اجتماعی ادارے تشکیل نہیں دیتے، اس وقت تک اسلام گویا عصر حاضر میں قابل عمل ثابت ہی نہیں ہوتا۔ آپ مغرب کی ملحدانہ فکر سے مرعوب ہو کر اور اس کے اداروں، خصوصاً جمہوریت کے ذریعے، اسلام لانے کا سوچیں گے تو اسلام اس طریقے سے تو ظاہر ہے نہیں آئے گا جیسا کہ پاکستان میں عملاً نہیں آیا البتہ اس کی جگہ سیکولرزم، لبرل ازم اور مادہ پرستی ضرور آئے گی جیسا کہ وہ پاکستانی معاشرے میں آ چکی ہے۔

۳۔ جدید دینی تحریکوں نے مسلم معاشرے میں پہلی جنگ عظیم کے بعد اسلامی ریاست اور مغربی فکر سے مستعار سیاسی جدوجہد کے ذریعے اسلامی ریاست کے قیام اور اس

کے ذریعے تبدیلیٔ نظام حیات کا جو نصب العین امت کو دیا اور جو دوسری دینی قوتوں نے بھی قبول کرلیا (جس کا مظہر ہمارے ہاں ۳۱ علماء کے ۲۲ نکات ہیں)، اس نے جو ذہن تیار کیا ہے، ہماری مندرجہ بالا باتیں اس کی سمجھ میں نہیں آتیں۔ وہ اگر تطہیر فکر، ذہن سازی اور دعوت واشاعت دین کی بات کرتی بھی ہیں تو اپنے مزعومہ اسلامی انقلاب اور قیام ریاست اسلامی کے لیے۔ تعمیر فرد اور اس کے ذریعے اصلاح معاشرہ وحکومت کے جس صحیح اور جامع تصور کی طرف ہم نے سطور بالا میں اشارہ کیا ہے، وہ ان کے پیش نظر ہوتا ہی نہیں۔ فرمانِ الٰہی اور اسوۂ نبی (صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم) کے مطابق 'تلاوت وتعلیم کتاب، تعلیم حکمت اور تزکیۂ نفس' ان کے پروگراموں کی بنیاد بنتا ہی نہیں۔ عالم کفر یعنی ملحدانہ مغربی فکر وتہذیب کے علمبردار ممالک اپنے گماشتہ مسلم حکمرانوں کے ذریعے پچھلی پون صدی سے ان مخلص خادمان دین کو ظلم وستم کا نشانہ بنا رہے ہیں اور ان بیچاروں کے حصے میں ناکامی کے سوا کچھ نہیں آیا.... لیکن اس کے باوجود وہ اپنے اجتہادی نقطۂ نظر پر نظر ثانی کرنے کے لیے تیار نہیں۔ ویژن اور بصیرت کی یہ کمی اللہ جانے کب تک انہیں مظلوم اور امت کو خوار وزبوں رکھے گی؟

۴۔ مختار فاروقی صاحب کا یہ اصرار کہ پاکستان میں نفاذ شریعت کے لیے اسے ایک حنفی ریاست ڈیکلیئر کیا جائے اور غیر حنفیوں کو الگ پرسنل لاء پر عمل کے لیے عدالتی نظام مہیا کیا جائے، ہمیں یقیناً بے جا لگا۔ اس سے مسلک پرستی اور فرقہ واریت کا عفریت مزید مضبوط ہوگا جیسا کہ حال ہی میں پنجاب اسمبلی سے پاس ہونے والے 'تحفظ بنیاد اسلام بل' کا نتیجہ نکلا تھا۔ وہ اس طرح ایک نان ایشو کو بہت بڑا ایشو بنا رہے ہیں۔ ان کی اطلاع کے لیے عرض ہے کہ پاکستان میں اس وقت جو اسلامی قوانین مثلاً حدود لاز اور قانون شہادت وغیرہ نافذ ہیں وہ حنفی فقہ ہی کے مطابق ہیں۔ اگرچہ ہمارا آئین بجا طور پر قرآن وسنت کو قانون سازی کی بنیاد قرار دیتا ہے اور عوام وعلماء نے اسے قبول کر رکھا ہے۔ ہماری رائے میں مسلکی اختلاف اسلامی قانون سازی کے حق میں کوئی بڑی رکاوٹ نہیں۔ اگر حکومت کی حقیقی خواہش ہو کہ ملک کے قوانین اسلامی ہوں تو حکمت سے اس معاملے کو سنبھالا جا سکتا ہے (اور ''قرآن وسنت'' کے ساتھ ''حنفی تشریح کے مطابق'' کے الفاظ کا دستور میں اضافہ بھی کیا جا سکتا ہے) تاہم موجودہ حالات میں یہ بحث فرقہ واریت کا پنڈورا باکس کھولنے کے مترادف ہے جبکہ اصل مسئلہ یہ ہے

کہ ہمارے ہاں کوئی حکومت آج تک نہ ایسی آئی ہے اور نہ آئندہ اس کے آنے کا امکان بظاہر نظر آتا ہے جو ملک کو اسلامی خطوط پر چلانا چاہتی ہو۔

اگر کوئی ایسی حکومت آجائے تو پاکستان میں غلبۂ اسلام کا صحیح طریقہ یہ نہیں کہ سب سے پہلے ملک کے قوانین مطابقِ اسلام بنادیے جائیں بلکہ یہ ہے کہ ''تلاوت و تعلیم کتاب، تعلیم حکمت اور تزکیۂ نفس'' یعنی نظام تعلیم، تربیتی اداروں اور میڈیا کو مطابق اسلام بنادیا جائے۔ مولانا اشرف علی تھانوی علیہ الرحمہ نے اپنی مجلس عصر میں ایک دفعہ فرمایا تھا کہ اگر مجھے اقتدار مل جائے تو قانون نافذ کرنے سے پہلے دس سال تک اصلاحی کام کروں گا۔ کاش ہمارے علماء و سکالرز کو اس بات کی حکمت سمجھ میں آجائے۔

۵۔ مسلک پرستی اور فرقہ واریت بلاشبہ غلبۂ دین کی راہ میں بہت بڑی رکاوٹ ہے۔ اس کے بیج انگریز نے اپنے مفادات کے لیے برصغیر کے علماء میں بوئے تھے۔ اب بھی بین الاقوامی اسلام اور مسلم دشمن قوتیں اور ان کی گماشتہ مسلم حکومتیں اس کی پشت پر ہیں لیکن اگر ہمارے دینی قائدین اخلاص اور فراست سے محروم نہ ہوتے تو ان کے جال میں نہ پھنستے۔ لہٰذا ہمیں دوسروں کو دوش دینے کی بجائے اپنی ہی عقل کا ماتم کرنا چاہیے۔

سوال یہ ہے کہ اس مسلک پرستی کو کم اور کمزور کرنے کے لیے کون کوشش کر رہا ہے؟ دینی مدارس؟ ہماری مساجد؟ ہماری اصلاحی تحریکیں؟ ہماری دینی سیاسی جماعتیں؟ نہیں، ان میں سے کوئی بھی نہیں بلکہ یہ سب اس مرض کی شدت میں اضافہ کر رہی ہیں۔ مولانا عبدالرؤف ملک صاحب کی متحدہ علماء کونسل، ہماری ملی مجلس شرعی، بعض دینی لوگوں کی قائم کردہ ملی یکجہتی کونسل یہ سب کمزور اور غیر مؤثر ادارے ہیں اور بگاڑ کی قوتیں طاقتور۔ علماء کا معاشی طور پر خود کفیل نہ ہونا اور مذاہب و مسالک کا تقابلی مطالعہ مفقود ہونا بھی اس کا سبب ہیں۔ لہٰذا عملاً اس کا کوئی امکان دور و نزدیک نظر نہیں آتا کہ یہ مسلکی جماعتیں نفاذ شریعت کے لیے اکٹھی ہو جائیں یا دین کا کوئی اور تعمیری کام مل کر کر سکیں۔

۶۔ سوال یہ ہے کہ اصلاح تعلیم و تربیت و میڈیا کا کام پاکستان کی دینی قوتیں اس وقت پرائیویٹ سیکٹر میں کیوں نہیں کرتیں؟ کس نے ان کا ہاتھ پکڑ رکھا ہے؟ 'حکمت بالغہ'

کیوں تجویز کرتا ہے کہ ایک 'اسلامی حکومت' آئے اور یہ کام کرے (وہ 'اسلامی حکومت' جس کے آنے کا عملاً کوئی امکان نہیں)۔ خود تنظیم اسلامی اور تحریک خلافت یہ کام کیوں نہیں کرتیں؟ صرف ایک جماعت اسلامی کے لوگوں کے پاس اس وقت تین یونیورسٹیاں، بیسیوں کالج اور ہزاروں سکول ہیں جن کی اکثریت اسلام کی بجائے مغربی فکر وتہذیب کے فروغ و غلبے کے لیے کام کر رہی ہے۔ اس وقت ہزاروں دینی مدارس ہیں جن کی اکثریت اپنے اپنے مسلک کے سپاہی تیار کر رہی ہے۔ وہ موحد نظام تعلیم، دین و دنیا کی تعلیم و تربیت کی یکجا فراہمی، تعمیر فرد، اصلاح معاشرہ اور مسلم حکومت کے لیے موزوں کارکن تیار کرنے کے لیے تیار ہی نہیں تو وہ اسلامی حکومت وجود میں آئے گی کیسے جو مجلس آئین ساز کے ذریعے بنیادی اسلامی اقدامات کرے گی؟

۷۔ 'حکمت بالغہ' تجویز کرتا ہے کہ مسلکی جماعتیں نفاذ شریعت کے لیے اٹھیں اور بریلوی مسلک کے علماء کرام اکثریت میں ہونے کی وجہ سے اس کام کا آغاز کریں۔ ہمارا علماء کرام سے رابطہ ہے اور ہم کہہ سکتے ہیں کہ اس وقت حنفی بریلوی مسلک سب مسلکوں سے زیادہ پھوٹ، انتشار اور تشتت کا شکار ہے۔ جتنے لیڈر ہیں اتنے ہی دھڑے اور جماعتیں ہیں اور اتنے ہی ان کے رُخ ہیں۔ کوئی مرکزی قیادت ہے ہی نہیں۔ جو لوگ اپنا گھر نہیں سنبھال سکتے وہ ساری دینی قوتوں کی قیادت کیسے کریں گے؟ پھر 'حکمت بالغہ' کہتا ہے کہ ۳۱ علماء کے ۲۲ نکات کی ہیئت ترکیبی کو ماڈل بنا کر دینی قوتیں آگے بڑھیں۔ ان ۲۲ علماء کی اکثریت تو حنفی دیوبندی علماء کی ہے جبکہ فاروقی صاحب بار بار سواد اعظم حنفی بریلوی مسلک کو قیادت دینے کی بات کرتے ہیں۔

۸۔ پاکستان میں غلبۂ دین کے لیے چھیڑی گئی 'حکمت بالغہ' کی بحث کے حوالے سے یہ چند گزارشات تھیں جو ہم قارئین کے سامنے رکھنا چاہتے تھے۔ اگر 'حکمت بالغہ' یا البرہان کے فاضل قارئین میں سے کوئی صاحب بحث میں حصہ لینا چاہیں تو ہم اس کا خیر مقدم کریں گے۔ وآخر دعوانا ان الحمدللہ ربّ العٰلمین.

اسلام اور پاکستان　　　　عابد اقبال کھاری﴿۱﴾

اقبال ہمیں وارا نہیں کھاتا

اقبال ہمیں وارا نہیں کھاتا اسی لیے یوم اقبال کی چھٹی ہی ختم نہیں کی گئی فکر اقبال کی بھی چھٹی کرا دی گئی ہے۔ ہونا بھی یہی چاہیے تھا۔ اقبال ہمارا دماغ خراب کر رہا تھا اس لئے اچھا کیا ہم نے اقبال ہی کی چھٹی کرا دی۔ دیکھیں نہ آئی ایم ایف اور ورلڈ بینک سے ہم نے قرضے لے لے کر ملک چلانا ہوتا ہے اور اقبال کہتا ہے کہ ؎

نگاہِ فکر میں شانِ سکندری کیا ہے؟
خراج کی جو گدا ہو وہ قیصری کیا ہے؟

کسے نہیں ہے تمنائے سروری لیکن
خودی کی موت ہو جس میں وہ سروری کیا ہے؟

بتوں سے تجھ کو امیدیں خدا سے نومیدی
مجھے بتا تو سہی اور کافری کیا ہے؟

اب آپ ہی بتائیں ہمیں یہ اقبال وارا کھاتا ہے؟ ہم پاکستانی مختلف مسالک کے پیروکار ہیں۔ کوئی بریلوی ہے، کوئی دیوبندی ہے، کوئی شیعہ ہے تو کوئی اہل حدیث۔ ہمارے نام نہاد علماء کا تو کاروبار ہی مسلک پرستی، شخصیت پرستی اور پیر پرستی سے چلتا ہے۔ ہم نے ایک دوسرے کو کافر قرار دینا ہوتا ہے۔ ایک دوسرے کو دائرہ اسلام سے خارج قرار دینا ہوتا ہے۔ ساری ساری عمر لگا کر ہمارے بزرگوں نے دوسرے مسالک کو باطل اور اپنے مسلک کو حق ثابت کیا ہے تو یہ سارے کام پر کیا اب ہم پانی پھیر دیں؟ کچھ تو خدا کا خوف کریں، یہ اقبال ہمیں وارا نہیں کھاتا۔ وہ تو ہمیں سمجھاتا پھرتا ہے کہ ؎

منفعت ایک ہے اس قوم کی نقصان بھی ایک
ایک ہی سب کا نبی، دین بھی ایمان بھی ایک

﴿۱﴾ چیئرمین پازیٹو پاکستان فاؤنڈیشن

حرم پاک بھی اللہ بھی قرآن بھی ایک
کچھ بڑی بات تھی ہوتے جو مسلمان بھی ایک

فرقہ بندی ہے کہیں اور کہیں ذاتیں ہیں
کیا زمانے میں پنپنے کی یہی باتیں ہیں

پھر وہ کہتا ہے ؎

یوں تو سیّد بھی ہو، مرزا بھی ہو افغان بھی ہو
تم سبھی کچھ ہو بتاؤ تو مسلمان بھی ہو

اب آپ ہی بتائیں یہ اقبال ہمیں وارا کھا سکتا ہے؟ ہم اپنی برادری کو سب سے اعلیٰ قوم اور دوسری برادریوں کو کم تر اور نیچ سمجھتے ہیں اور ہم تو اپنے بچوں کے رشتے بھی دوسری برادریوں میں نہیں کرتے اور اقبال ہمیں کہتا ہے ؎

غبار آلودۂ رنگ ونسب ہیں بال و پر تیرے
تو اے مرغِ حرم اڑنے سے پہلے پرفشاں ہو جا

نہ بابا! یہ اقبال ہمیں وارا نہیں کھاتا۔ اقبال پتا نہیں کس دنیا کے خواب دیکھتا رہتا ہے اور پتا نہیں کس خوش فہمی میں یہ کہتا ہے کہ ؎

ایک ہوں مسلم حرم کی پاسبانی کے لیے
نیل کے ساحل سے لے کر تابخاکِ کاشغر

او بھائی! حرم کی پاسبانی کے لیے اب امریکہ اور اسرائیل موجود ہیں۔ پاسباں مل گئے کعبے کو صنم خانے سے۔ مسلمان تو ویسے بھی دال روٹی کے چکر میں پڑے ہیں۔ ہمارے عرب بھائی سمجھدار ہیں اسی لئے وہ اسرائیل کو دل وجان سے تسلیم کر رہے ہیں۔ اقبال کے پیچھے لگ کر جذباتی ہونے کی ضرورت نہیں۔ یہ اقبال ہمیں وارا نہیں کھاتا۔ یہ تو بڑے ارام سے کہہ دیتا ہے کہ ؎

جس کھیت سے دہقاں کو میسر نہ ہو روزی
اس کھیت کے ہر خوشۂ گندم کو جلا دو

لو کرلو بات! اگر ہم نے گندم اور آٹے کے بحران پر قابو پالیا تو فلور ملز مافیا تو بیچارہ بھوکا مر جائے گا اور ان کی ملیں اور جہاز کیسے چلیں گے؟ ہمارے ایم پی ایز اور ایم این اے انہی

جہازوں میں بیٹھ کر ایک پارٹی سے دوسری پارٹی میں جا رہے ہوتے ہیں۔ اسی سے یہ جمہوری نظام چل رہا ہے اور یہی ہماری جمہوریت کا حسن ہے۔ اللہ نہ کرے اسے نظر لگے اقبال کی۔ یہ تو عجیب باتیں کرتا ہے ہمیں یہ اقبال وارا کھا ہی نہیں سکتا۔ ہم نے پہلے انگریز کی غلامی میں بہت خوش وخرم زندگی گزاری ہے پھر ستر سال سے ہم امریکہ کے غلام بنے ہوئے ہیں اور امریکی ڈالروں سے بڑے خوش ہوتے ہیں بلکہ اپنے بیٹے بیٹیاں بھی ڈالروں کے عوض امریکہ کو دینے پڑیں تو ہم یہ کام بھی بڑی ڈھٹائی سے کرتے ہیں۔ اقبال کو تو سمجھ نہیں تھی کہ ؎

غیرت نہیں، ڈالر ہے بڑی چیز جہانِ تگ ودو میں
پہناتی ہے یہ درویش کو تاجِ سرِ دارا

اور اقبال کو پتا نہیں کیا تکلیف ہوتی ہے جو کہتا ہے ؎

یورپ کی غلامی پہ رضامند ہوا تُو
مجھ کو تو گِلہ تجھ سے ہے یورپ سے نہیں ہے

اللہ کا بڑا فضل ہے، اللہ کی بڑی رحمتیں ہیں ہم اس غلامی پر رضامند ہیں اور اس پر مطمئن ہیں کہ یہ ہمارے مقدر میں اللہ نے لکھی ہوئی تھی بلکہ اگر کہیں مکافاتِ عمل کے نتیجے میں امریکہ برباد بھی ہو گیا یا روس کی طرح اس کے بھی حصے بخرے ہو گئے تو ہم چین جیسی کسی نئی طاقت کو اپنا آقا مان کر اس کی غلامی میں چلے جائیں گے۔ غلامی میں بڑا مزا ہے، بڑا سکون ہوتا ہے۔ ہمیں اقبال کی باتوں میں نہیں آنا چاہیے۔ اس نے تو پتا نہیں کہاں سے متاثر ہو کر کہہ دیا ؎

از خوئے غلامی ز سگاں خوار تر است
من ندیدم کہ سگے پیشِ سگے سر خم کرد

یہ غلامی کی خُو تو کتے سے بھی بدتر ہونے کی علامت ہے کیونکہ میں نے نہیں دیکھا کہ کسی کمزور کتے نے بھی کسی طاقتور کتے کے آگے سر جھکایا ہو۔ پھر یہ اقبال کہتا ہے ؎

یہ پورب یہ پچھّم چکوروں کی دنیا
میرا نیلگوں آسماں بے کرانہ

اور کبھی کہتا ہے ؎

تو شاہیں ہے پرواز ہے کام تیرا
تیرے سامنے آسماں اور بھی ہیں

اور یہ کہتا ہے ؎

صحرا است کہ دریا ست تہہِ بال و پرِ ماست

یہ اقبال بڑی سوچ کی بات کرتا ہے، وسعت نظری کی اور بلند پروازی کی بات کرتا ہے۔ پتہ نہیں یہ کس زمانے کی باتیں ہیں اور ہم کوئی فرنچ، جرمن، ترک، سکنڈے نیوین تو ہیں نہیں جو اقبال ہم سے ایسی باتیں کرتا رہتا ہے۔ اسے پتا نہیں کہ ہمارا کنواں بھی چھوٹا نہیں بہت بڑا کنواں ہے جس میں ہم فکری طور پر رہتے ہیں۔ کیا ضرورت ہے بڑی چھلانگیں لگانے کی اور رِسک لینے کی اور نئے جہان آباد کرنے کی۔ یہ کہتا ہے ؎

وہی جہاں ہے تیرا جس کو تو کرے پیدا
یہ سنگ و خشت نہیں جو تیری نگاہ میں ہے

لو بتاؤ بھلا! ایسا اقبال ہمیں وارا کھا سکتا ہے؟ پھر کہتا ہے ؎

اپنی دنیا آپ پیدا کر اگر زندوں میں ہے
سرِّ آدم ہے ضمیر کن فکاں ہے زندگی

ایسی باتیں کر کر کے ہی اقبال ہماری نئی نسل کو گمراہ کر رہا تھا، اچھا کیا ہم نے اسے دیس نکالا دے دیا۔ کسی نے ٹھیک ہی کہا تھا کہ انگریز کو پتہ چل جاتا کہ یہ اقبال کیا چیز ہے تو اسے سر کا خطاب دینے کی بجائے پھانسی پر چڑھا دیتے۔ یہ اقبال ہمیں وارا نہیں کھا سکتا جو کہتا ہے ؎

آتی ہے دمِ صبح صدا عرش بریں سے
کھویا گیا کس طرح تیرا جوہرِ ادراک

کس طرح ہوا کند تیرا نشترِ تحقیق
ہوتے نہیں کیوں تجھ سے ستاروں کے جگر چاک

لو نئی سنو اس اقبال کی! جناب ہمیں یہ سمجھانے کی کوشش کر رہے ہیں کہ تم نے تحقیق کا میدان کیوں چھوڑ دیا؟ علم و ہنر کے آسمان پر تم نے کمندیں ڈالنی تھیں، تم نے غور و فکر کیوں چھوڑ دیا؟ اب اس اقبال کو کون سمجھائے کہ جب امریکی، اسرائیلی، انگریز، چینی، جاپانی، جرمن، فرانسیسی قومیں پہلے ہی علم و تحقیق کے میدان میں دن رات کام کر رہی ہیں تو ہمیں اپنے دماغ کا الو بنانے کی کیا ضرورت ہے؟ مجھے تو لگتا ہے اقبال کا اپنا دماغ کام نہیں کرتا۔ یہ اقبال ہمیں وارا نہیں کھا سکتا۔

آخر میں مبارک باد پیش کرتا ہوں مَیں نواز شریف صاحب کو جن کے دور میں یوم اقبال کی چھٹی ختم کر دی گئی اور جس پر عمران خان صاحب نے احتجاج بھی کیا تھا۔ پھر خان صاحب کی اپنی حکومت آ گئی اور معلوم ہوتا ہے کہ پھر انہیں بھی اقبال کی بروقت سمجھ آ گئی اسی لیے یوم اقبال کی چھٹی انہوں نے بھی بحال نہیں کی۔ ان کو بھی مبارک ہو اور ہماری اشرافیہ کو بھی مبارک ہو۔ یہ قوم سوئی ہے ،سوئی رہے گی۔ آپ کا راج قائم ہے، قائم رہے گا۔ بلند فکری مردہ باد۔ ذہنی غلامی زندہ باد۔

بقیہ: دینی مدارس کا نظام تعلیم - بنیادی تبدیلیاں ناگزیر ہیں

۹۔ نظام تعلیم ہمیشہ تصورِ انسان کے تابع ہوتا ہے۔ ہمارا تصور انسان واضح ہے اور اگر ہمارا تعلیمی نظام مکمل طور پر اس کے تابع نہیں ہے تو ہمیں ہر کام چھوڑ کر اس کی اس کمی کو پورا کرنا چاہیے۔ انسان کے تمام اقدار اس کے نظام تعلیم میں منعکس ہوتے ہیں اور پھر اسی سے پیدا ہوتے ہیں حتیٰ کہ دین، تہذیب وغیرہ بھی اسی کے زیر اثر ہوتے ہیں۔ کوئی بھی نظام بناتے یا اختیار کرتے وقت اس نزاکت کو نظر انداز نہیں کرنا چاہیے۔ اس کے نتائج صرف تاریخی نہیں بلکہ تقدیری ہوتے ہیں۔

۱۰۔ وہ نظام تعلیم کبھی کامیاب نہیں ہو سکتا جو محض ذہنی استعداد پر منحصر ہو۔ علم کی صورت کا حصول تو یقیناً دماغی صلاحیت کے فرق کی وجہ سے کامل یا ناقص رہ جاتا ہے لیکن علم محض صورت نہیں ہے۔ اس کی ایک حقیقت بھی ہے جو کم ذہنی استعداد والوں کو بھی اسی طرح اور اتنی ہی حاصل ہو سکتی ہے جس طرح اور جتنی اعلیٰ درجے کے اذہان کو۔ یہ مسلمانوں کے نظریۂ تعلیم کا عظیم الشان اختصاص اور انفرادیت ہے۔

ان تصورات کا حامل کوئی شخص جب دینی مدارس کے نظام تعلیم پر تنقیدی نظر ڈالے گا تو ایک تو اس کا کوئی ٹھوس سبب ضرور ہو گا اور دوسرے وہ تنقید معاندانہ ہرگز نہیں ہو گی۔ زیر نظر کتاب میں ڈاکٹر محمد امین صاحب نے خیر خواہی کی پوری قوت کے ساتھ اہل مدارس کو نہ صرف یہ کہ کچھ مشورے دیئے ہیں بلکہ ان مشوروں کو عمل میں لانے کی صورتیں بھی تجویز کی ہیں۔ اگر ارباب مدارس نے ان کے اخلاص اور تعاون کو کسی حد تک بھی قبول کر لیا تو امید ہے کہ دینی تعلیم کی اصلی روایت کا احیاء واقع میں بھی لائق یقین حد تک ممکن ضرور ہو جائے گا۔

عالم اسلام مدیر

امت مسلمہ کے خلاف مسیحی صہیونی گٹھ جوڑ

اس اہم سٹریٹجیک چیلنج کے توڑ کے لیے مسلم حکمرانوں، علماء اور دانشوروں کو سوچنا چاہیے

مسلم امہ کو اس وقت بہت سے چیلنجز درپیش ہیں۔ ان میں سے ایک اہم چیلنج یہ ہے کہ پچھلی ایک ڈیڑھ صدی سے صہیونیوں اور مسیحیوں نے مسلمانوں کے خلاف گٹھ جوڑ کر رکھا ہے جس کے اہم مظاہر یہ ہیں: خلافت کا خاتمہ، فلسطین میں یہودی ریاست کا قیام اور اس کی بقاء و استحکام کی مسلسل حمایت، مسلم علاقوں کو چھوٹی چھوٹی ریاستوں میں تقسیم کرنا، خصوصاً مشرق وسطیٰ میں تاکہ یہودی ریاست کو کوئی خطرہ درپیش نہ ہو۔ مسلم ریاستوں میں اپنی مرضی کی حکومتیں بنوانا، انہیں سیاسی، معاشی اور دفاعی لحاظ سے مستحکم نہ ہونے دینا، ان میں مسلم حکمرانوں اور عوام میں دوری پیدا کرنا، مسلم حکمرانوں کے ذریعے اسلامی جماعتوں کو کچلنا اور انہیں کامیاب نہ ہونے دینا، مسلم ریاستوں کو متحد نہ ہونے دینا اور اتحاد کے لیے کوئی فعال ادارہ نہ بننے دینا، انہیں تعلیم و تحقیق اور سائنس و ٹیکنالوجی میں پس ماندہ رکھنا، مغرب زدہ میڈیا، تعلیم، ادب اور مذہبی سکالرز کے ذریعے فکری انتشار پیدا کرنا، دنیا کی ایک چوتھائی تعداد ہونے کے باوجود اقوام متحدہ کی سلامتی کونسل میں مسلمانوں کی نمائندگی نہ ہونے دینا، انہیں غیر اسلامی بین الاقوامی معاہدوں پر دستخط کرنے پر مجبور کرنا.... یہ امور مشتے نمونہ از خروارے ہیں ورنہ آپ ان کی تفصیل میں جائیں اور جتنا گہرائی میں جا کر غور کریں گے آپ کو نئے نکات ملتے جائیں گے۔

سوال یہ ہے کہ مسلمانوں کے خلاف اس صہیونی مسیحی گٹھ جوڑ کے اسباب کیا ہیں:

۱۔ اس کی بنیادی وجہ ان دونوں گروہوں کا اسلام اور مسلمانوں سے حسد، نفرت، ان کی بدخواہی، ان سے دشمنی اور ان کو مٹانے کی خواہش ہے جس کی گواہی قرآن مجید نے دی ہے [۱]۔ اور ہم لوگ اس کے عینی شاہد ہیں۔ دونوں گروہ دشمن ہیں تاہم یہود اور صہیونی اس دشمنی میں مسیحیوں سے شدید تر ہیں۔

---

[۱] آل عمران ۳:۱۱۹، ۱۲۰

۲۔ جس امر نے ان دونوں گروہوں کو متحد کر دیا ہے وہ آمد مسیحؑ کا مذہبی نظریہ ہے۔ یہودی اپنے صحف مقدسہ کے مطابق اس انتظار میں ہیں کہ کب ان کا مسیحا آئے گا جو گریڑ اسرائیل قائم کرے گا اور انہیں دنیا پر غلبہ دلائے گا[۱]۔ اس کے لیے ضروری کہ ارضِ مقدس (فلسطین) اور یروشلم (بیت المقدس) پر ان کا قبضہ ہو، اور وہ ہیکلِ سلیمانی کی از سرِ نو تعمیر کریں جس پر ان کے بقول اس وقت مسلمانوں نے زبردستی قبضہ کر کے وہاں مسجد (مسجد اقصیٰ) قائم کر رکھی ہے۔ اس مقصد کے لیے انہوں نے نہایت ہوشیاری سے مسلسل پروپیگنڈا کر کے یہ بات بعض بنیاد پرست مسیحی گروہوں میں پھیلا دی ہے کہ صحف مقدسہ کے مطابق تمہارے مسیحا بھی اُس وقت تک زمین پر نہیں آسکیں گے جب تک کہ ہمارا ٹیمپل (ہیکل) مسلمانوں سے واگزار کرا کے اسے از سرِ نو تعمیر نہ کیا جائے۔ چنانچہ مسیحی قوتوں نے جب پہلی جنگ عظیم میں عثمانیوں پر فتح حاصل کی اور ان کے علاقوں پر قبضہ کیا تو صرف یہی نہیں ہوا کہ فرانسیسی جنرل نے صلاح الدین ایوبی کی قبر کو ٹھڈا مارتے ہوئے کہا کہ ''اٹھو صلاح الدین! ہم آگئے ہیں'' اور برطانوی جنرل نے بیت المقدس میں فاتحانہ داخل ہوتے ہوئے کہا کہ ''آج صلیبی جنگوں کا خاتمہ ہوا ہے'' بلکہ فوراً ہی (۱۹۱۷ء میں) بالفور ڈیکلریشن کا اعلان کر دیا گیا اور یہودیوں کو فلسطین میں آباد ہونے کا پروانہ جاری کر دیا گیا۔ بعد میں اسرائیل کا قیام اور اس کی مسلسل حمایت اسی پالیسی کی توسیع ہے اور ہماری آنکھوں دیکھتے اور کانوں سنتے چند سال پہلے جب صدر بش نے اسرائیل کی حفاظت و حمایت میں عراق پر حملہ کیا تو بے اختیار اس کے لیے صلیبی جنگ کے الفاظ اس کے منہ سے نکل گئے (جسے بعد میں منافقانہ ڈپلومیسی کے تحت اس نے مسابقت لفظی قرار دے دیا کہ زبان پھسل گئی تھی)۔ حال ہی میں امریکی صدر ٹرمپ نے مشرقی بیت المقدس کو اسرائیل کا دارالحکومت بنانے کا اعلان کر دیا ہے اور آئے روز حیلے بہانے یہودی مسلمانوں کو مسجد اقصیٰ میں نماز پڑھنے سے روکتے ہیں اور خود وہاں جا کر عبادت کرتے ہیں۔ یہ خبریں بھی آتی رہتی ہیں کہ مسجد اقصیٰ کے نیچے سرنگیں کھودی جا رہی ہیں، اسے آگ لگانے کی کوشش بھی کی گئی۔ گویا در پردہ کوششیں جاری ہیں کہ مسجد اقصیٰ گرا دی جائے تا کہ اس کی جگہ ہیکل تعمیر کیا جا سکے۔

---

[۱] مسلمان بھی مانتے ہیں کہ ایک مسیح دجال آئے گا جو غیر معمولی قوتوں کا حامل ہوگا اور یہودیوں کو عارضی فتح دلوائے گا یہاں تک کہ امام مہدی اور حضرت مسیحؑ نزول فرمائیں گے اور مسیح دجال کو قتل کر دیں گے۔

مسلمانوں کی نفرت میں بنیاد پرست مسیحیوں نے صہیونیوں کا یہ دانہ چگ لیا اور ان کی حمایت میں سربکف ہو گئے۔ ان لوگوں کو امریکہ میں مسیحی صہیونی (Christian Zionist) کہا جاتا ہے وہ یہودیوں سے بڑھ کر یہودی مفادات کے علمبردار ہیں اور انہوں نے امریکہ میں اپنے نظریات تیزی سے اور شدت سے پھیلائے ہیں جنہیں Dispensationalism یا Evangelicalism کہا جاتا ہے۔ حال ہی میں اسے ’مسیحیت جدیدہ‘ (Born Again Christianity) بھی کہا جانے لگا ہے۔ امریکی مصنفہ گریس ہال سیل نے اپنی کتاب ’Forcing God's Hand‘ میں لکھا ہے کہ ان لوگوں نے عقیدہ بنالیا ہے کہ قیامت کے نزدیک زمین پر جس قدر بھی خون بہے گا، ان کے مسیحا بھی اسی قدر جلد زمین پر اتریں گے۔ وہ کہتی ہیں کہ Born Again عقیدے کا مطلب ہی عیسائیوں کے ہاتھوں ٹیمپل (ہیکل سلیمانی) کی نئی تعمیر اور مسیح کی جلد واپسی ہے۔[۱]

۳۔ اسرائیل کی حفاظت، حمایت اور استحکام کے لیے مسیحی مغرب نے شرق وسطیٰ کے مسلم ممالک کو چھوٹی چھوٹی کمزور ریاستوں میں تقسیم کر دیا۔ مصر کچھ بہتر پوزیشن میں تھا تو اسے پہلے نظریاتی خلفشار میں مبتلا کر کے کمزور کیا، اسرائیل سے اسے پٹوایا اور پھر اسے پرامن ترقی کی راہ دکھا کر ایسی قیادت سامنے لایا جو اس مسئلے کو سیاسی طور پر حل کرے چنانچہ مصریوں کی اسرائیل سے صلح کرادی گئی۔ بیچ میں مرسی آ گیا تو فوج اور عدالت کے گٹھ جوڑ سے اس کا کانٹا نکال دیا۔ عراق میں صدام نے مضبوط حکومت کر لی تھی۔ پہلے اسے ایران سے لڑا کر کمزور کیا۔ اس کے بعد کویت کے بہانے سے اس پر حملہ کر کے اس کا تیا پانچہ کر دیا۔

مصر اور عراق کا کانٹا نکالنے کے بعد اب ان کو پاکستان چبھتا ہے جو مشرق وسطیٰ کے اسرائیل مخالف مسلم ممالک کی عملی اور فوجی مدد کرتا ہے اور اسرائیل کو تسلیم کرنے پر تیار نہیں۔ اس کے لیے مسیحی مغرب اور یہودیوں کو بھارتی ہندوؤں کی مدد بھی حاصل ہے۔ افغانستان پر حملے کا ایک بڑا مقصد یہ بھی تھا کہ پاکستان کی ایٹمی قوت ختم کی جائے اور اسے مغلوب کیا

---

[۱] جناب رضی الدین سید نے اس کتاب کا ترجمہ ”خوفناک جدید صلیبی جنگ“ کے عنوان سے کیا ہے جو راحیل پبلی کیشنز اردو بازار کراچی سے دستیاب ہے۔ ہم نے اس مضمون میں ان کے مقالے ”مسلم صہیونیت“ سے استفادہ کیا ہے جو ماہنامہ میثاق کے نومبر ۲۰۲۰ء کے شمارے میں شائع ہوا ہے۔

جائے۔ پاکستان کی مضبوط فوج بھی ان کی آنکھوں میں خار کی طرح کھٹکتی ہے۔ اخبارات میں آتا رہا ہے کہ کہوٹہ پر حملہ کرنے کے لیے اسرائیلی طیارے سری نگر پہنچ گئے تھے اور امریکی و اسرائیلی خصوصی فوجی دستے پاکستان کے ایٹمی اثاثوں پر قبضے کے لیے خلیج میں بھیجے گئے تھے۔ بہرحال اللہ تعالیٰ نے اپنے فضل و کرم سے آج تک پاکستان کو ان کی سازشوں سے محفوظ رکھا ہے۔

حال ہی میں امریکی صدر ٹرمپ نے نہ صرف بیت المقدس کو اسرائیلی دارالحکومت بنانے اور غرب اردن کے علاقے کو اسرائیل میں ضم کرنے کی اجازت دی ہے بلکہ امارات، بحرین اور سوڈان پر دباؤ ڈال کر اسرائیل سے ان کی دوستی بھی کرادی ہے اور اس مقصد سے سعودی عرب اور پاکستان پر دباؤ جاری ہے۔ خود امریکہ کے اندر یہودی لابی معاشی، سیاسی اور ثقافتی لحاظ سے اتنی مضبوط ہے کہ صدر خواہ ڈیموکریٹ ہو یا ری پبلکن، یہودیوں اور ان کے سرپرست شدت پسند عیسائیوں کی حمایت کے بغیر نہ انتخابات جیت سکتا ہے اور نہ حکومت چلا سکتا ہے۔

پس چہ باید کرد

ان حالات سے سمجھا جاسکتا ہے کہ مسلمانوں کے لیے حالات کتنے گھمبیر ہیں لیکن مسلمان امت خوابِ غفلت میں سوئی ہوئی ہے۔ مسلمان ممالک میں اکثر حکمران مغربی قوتوں کے گماشتہ ہیں اور ان کی پالیسیوں کو لے کر چلتے ہیں۔ عوام اسلام چاہتے ہیں لیکن حکمران اسلام پسندوں اور اسلامی جماعتوں کو کامیاب نہیں ہونے دیتے۔ مسیحی مغرب نے مشرق وسطیٰ میں (ایران کو اندرخانے ساتھ ملاکر) شیعہ سنی منافرت کی آگ بھڑکائی ہوئی ہے۔ پاکستان کے سر پہ بھارت اور افغانوں کو مسلط کر رکھا ہے۔ مغرب میں موجود مسلمانوں کا گلا دن بدن گھونٹا جارہا ہے۔ یوں امت کمزور اور خوار و زبوں ہے اور مسیحی صہیونی گٹھ جوڑ نے مسلمانوں کی زندگی تنگ کر رکھی ہے۔ یہ حالات ایسے نہیں کہ ان پر آنکھیں بند کرلی جائیں کہ جو ہوتا ہے ہوتا رہے بلکہ اس پر گہری فکری مندی کی ضرورت ہے۔ اس پر جاگنے اور پہرہ دینے کی ضرورت ہے بلکہ حکمت و دانش سے دشمنوں کی سازشوں کا توڑ کرنے کی ضرورت ہے۔ اس ضمن میں مسلم حکمرانوں، علماء اور دانشوروں کی سٹریٹجی کیا ہونی چاہیے؟ اس کے لیے چند طالب علمانہ تجاویز حاضر خدمت ہیں:

۱۔ مسلم دینی جماعتوں اور علماء کو دنیا بھر کے مسیحیوں خصوصاً امریکی مسیحیوں تک یہ بات مذہبی رنگ اور انداز میں پہنچانی چاہیے کہ تم کیسے یہودیوں کا ساتھ دے رہے ہو جبکہ وہ تمہارے مسیح کے قاتل ہیں اور اپنے مسیحا کے آنے پر تم پر بھی غلبے کے خواب دیکھ رہے ہیں۔ اس بات کو ان کی زبان اور ان کی علمی سطح کے مطابق اور ان کے لہجے میں جذباتی انداز میں مسلسل پہنچانا چاہیے۔

۲۔ مغرب میں جو مسیحی مغربی فکر و تہذیب یا مغربی مظالم کے خلاف ہیں، مسلم جماعتوں اور دانشوروں کو ان کے ساتھ رابطہ کرنا چاہیے بلکہ ان کے ساتھ گہرے مراسم قائم کرنے چاہئیں اور ان کے ساتھ مل کر مغربی فکر و تہذیب کے خلاف محاذ بنانا چاہیے اور اس کے خلاف تحریک چلانی چاہیے۔ یہ کام وسیع پیمانے پر ہونا چاہیے اور ان دونوں کاموں میں مسلم حکومتوں کو دینی قوتوں کی ہر قسم کی مدد اور سرپرستی کرنی چاہیے۔

۳۔ ہمارے ہاں سٹریٹجی پہ کام کرنے والوں کو سوچنا چاہیے کہ ان یورپی قوتوں کی ہمنوائی کی جائے جو امریکی بالادستی سے خائف ہیں اور یورپ کو امریکی اثر اور دباؤ سے نکالنا چاہتی ہیں۔ لاطینی امریکہ کے ممالک سے دوستی اور استفادہ بھی ضروری ہے۔

۴۔ امریکی و یورپی ریاستوں میں جہاں اقلیتوں، کمزور گروہوں اور صوبوں پر ظلم ہو رہا ہے اور ان کی حق تلفی ہو رہی ہے (جیسے امریکہ میں کالے امریکیوں کے خلاف اور وہاں ۲۵ ریاستوں نے علیحدگی کی درخواست دے رکھی ہے) ان کی حمایت کرنی چاہیے۔

۵۔ مسلمان ریاستوں کو متحد کرنے کی کوشش کی جائے۔ اگر اس میں مزاحمت ہو تو دینی جماعتوں، معاشرتی تحریکوں، تعلیمی اداروں اور پرائیویٹ سیکٹر کی تنظیموں کے ذریعے مسلمان ملکوں میں معاشرتی و تعلیمی سطح پر وسیع نیٹ ورکنگ کی جائے جو اس وقت مفقود ہے۔ مسلمان ریاستیں ان کاموں کی نصرت، سرپرستی بلکہ پلاننگ کریں۔

۶۔ یہود و ہنود و نصاریٰ کے شر سے بچنے کے لیے وقتی طور پر چین اور روس سے مدد لی جائے۔

۷۔ پاکستان کے سٹریٹیجک اداروں کو ان سیاسی اور دینی لوگوں کی حوصلہ شکنی کرنی

چاہیے جواسرائیل کوتسلیم کرنے کی بات کرتے ہیں۔ یہ لوگ کس طرح کام کرتے ہیں ہم اس کی ایک مثال آپ کے سامنے رکھتے ہیں۔ یہ آج سے دس گیارہ سال پہلے کی بات ہے کہ راقم مولانا زاہدالراشدی صاحب کی شریعہ اکیڈمی گوجرانوالہ میں کسی پروگرام کے سلسلے میں گیا۔ واپسی پر چلتے ہوئے ان کے صاحبزادے عمار ناصر صاحب نے ایک لفافہ ہاتھ میں پکڑایا کہ ایک مضمون ہے، اسے پڑھ کر اپنی رائے سے نوازیں۔ ہم نے پندرہ بیس صفحے کا وہ مضمون پڑھا۔ اس میں دلائل سے یہ بات ثابت کی گئی تھی کہ مسجد اقصیٰ پر مسلمانوں کے مقابلے میں یہودیوں کا حق فائق ہے اور یہی عدل کا تقاضا ہے۔ ہم اس فکر پر حیران پریشان رہ گئے۔ بعد میں یہ مضمون غالباً ماہنامہ الشریعہ میں شائع بھی ہوا تھا۔

۸۔ مسلم امہ کی یونیورسٹیوں میں اس موضوع پر تحقیق ہونی چاہیے۔ اس پر نہ صرف پی ایچ ڈی سطح کے تحقیقی مقالات لکھے جانے چاہئیں بلکہ خصوصی تحقیقی ادارے بھی بننے چاہئیں۔ اس وقت برکلے (کیلی فورنیا، امریکہ) میں ایک ادارہ ''Islamophobia Studies Centre'' (اسلاموفوبیا سٹڈیز سنٹر) کے نام سے عمدہ کام کررہا ہے۔ وہ اپنی تحقیقات سے مسلمانوں کو متنبہ کررہا ہے کہ غیر مسلم عیسائی و یہودی قوتیں مسلمانوں کے خلاف بہت دوررس، تیز اور گہری سازشوں میں مصروف عمل ہیں اور مسلم حکومتوں کو اب ہر سمت، ہر قدم اور ہر بیرونی حکومت سے محتاط رہنا چاہیے۔ ملائشیا اور ترکی میں ''Occidental Studies Centre'' (اوکسیڈینٹل سٹڈیز سنٹر) کے نام سے ادارے موجود ہیں لیکن کوئی خاص کام نہیں کررہے۔ پاکستان میں ایریا سٹڈی سنٹر کھلے تھے اور قائداعظم یونیورسٹی میں امریکہ ویورپ پر کام ہونا تھا لیکن ہمارے علم میں نہیں کہ وہاں اس طرح کا کام ہوا ہو جس کی طرف ہم اشارہ کررہے ہیں۔

۹۔ ہمیں یہ دیکھ کر افسوس ہوتا ہے کہ مغربی فکروتہذیب کی تفہیم اور اسلامی تناظر میں اس کا تنقیدی مطالعہ ہمارے مدارس اور یونیورسٹیوں کے نصاب میں شامل نہیں ہے، نہ اس سے متعلقہ موضوعات پر تحقیق کا چلن ہے۔ یہ صورتِ حال نظرثانی کی شدید محتاج ہے۔ اگر مغرب میں اوری اینٹلزم پر سیکڑوں ادارے اسلامی ومشرقی علوم پر تحقیق وتدریس کے لیے بن سکتے ہیں تو ہم کیوں خواب غفلت میں مدہوش پڑے ہیں اور ہماری یونیورسٹیاں کیوں بانجھ ہیں کہ مطالعۂ مغرب اور امہ سٹڈیز کے لیے ہمارے ہاں ایک ادارہ بھی کام نہیں کررہا۔

اسلام اور مغرب

ڈاکٹر زاہد صدیق مغل

مغرب کا ہیومن رائٹس کا تصور غیر اسلامی ہے

اسے اسلام کے حقوق العباد یا خطبۂ حجۃ الوداع سے ثابت کرنے کی کوشش کرنا حماقت ہے

ہیومن رائٹس اور حقوق العباد کا فرق

اسلامی تعلیمات وتصوراتِ زندگی کو مغربی تناظر میں پہنچانا مسلم مفکرین کی سب سے سخت غلطی ہے۔ ان غلطیوں میں سے ایک بنیادی اور اہم ترین غلطی حقوق العباد کو ہیومن رائٹس کے تناظر میں سمجھنا ہے۔ عام طور پر ہیومن رائٹس کا ترجمہ غلط طور پر ''انسانی حقوق'' کر کے نہ صرف انہیں حقوق العباد کے ہم معنی تصور کر لیا جاتا ہے بلکہ یہ ثابت کرنے کی کوشش بھی کی جاتی ہے کہ ہیومن رائٹس سب سے پہلے اسلام نے دنیا کو عطا کیے نیز خطبہ حجۃ الوداع میں نبی کریم ﷺ نے انہی حقوق کی تعلیمات دی تھیں (العیاذ باللہ)۔ ان دونوں کا فرق ایک آسان مثال سے سمجھا جاسکتا ہے۔ فرض کریں ایک دستوری جمہوری ریاست کے دو مرد آپس میں میاں بیوی بن کر رہنا چاہتے ہیں۔ یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا انہیں ایسا کرنے کا ''حق'' ہے یا نہیں۔ اگر اس سوال کا جواب کسی مذہب (اسلام، عیسائیت وغیرہ) کے عالم سے پوچھا جائے تو وہ اس کا جواب ارادۂ خداوندی میں ظاہر ہونے والے خیر یعنی اللہ تعالیٰ کی کتاب کی روشنی میں دے گا۔ مثلاً ایک مسلمان عالم یہ کہے گا کہ چونکہ قرآن وسنت میں اس کی ممانعت ہے لہٰذا کسی بھی فرد کو ایسا کرنے کا ''حق'' حاصل نہیں ہے۔ اس کے مقابلے میں وہ شخص جو ''ہیومن رائٹس'' کو اعلیٰ ترین قانون مانتا ہو اس فعل کو اس دلیل کی بنا پر جائز قرار دے گا کہ چونکہ ہر شخص کا یہ بنیادی حق ہے کہ وہ اپنی خوشی کا سامان اپنی مرضی کے مطابق جیسے چاہے مہیا کر لے، لہٰذا اگر دو مرد آپس میں شادی کر کے اپنی خواہش پوری کرنا چاہتے ہیں تو انہیں ایسا کرنے کا پورا حق حاصل ہے۔ یہی وہ دلیل ہے جس کی بنیاد پر مغربی دنیا میں دو مردوں کی شادی، زنا بالرضا، اغلام بازی وغیرہ کو قانونی جواز عطا کر دیا گیا ہے۔ ایک دستوری جمہوری ریاست میں افراد کے پاس ہمیشہ یہ حق محفوظ ہوتا ہے کہ وہ ارادۂ خداوندی کو پسِ پشت ڈال کر

ہیومن رائٹس کی آڑ میں عمل لواطت کا جواز حاصل کرلیں۔ (۱) اس مثال سے واضح ہوجانا چاہیے کہ ''حقوق العباد'' کا جواز اور اس کی ترتیب ارادۂ خداوندی سے طے ہوتی ہے یعنی ایک انسان (عبد) کو کسی عمل کا حق ہونے یا نہ ہونے کا فیصلہ کتاب وسنت سے ہوتا ہے۔ اس کے مقابلے میں ہیومن رائٹس کا جواز انسان کو خودمختاریت کے دعوے سے نکلتا ہے۔ اسلامی نقطۂ نگاہ سے ''حقِ زندگی'' فرد کا کوئی ایسا حق نہیں جس کا جواز ماورائے اسلام کسی فطری قانون سے نکلتا ہو بلکہ اس کا ماخذ کتاب وسنت کی نصوص کے سوا اور کچھ نہیں۔ چونکہ اسلامی نقطۂ نگاہ سے فرد اپنی زندگی کا مالک نہیں بلکہ یہ اس کے ربّ کی عنایت ہے اسی لیے فرد اپنی زندگی کو جیسے وہ چاہے ترتیب دینے کا حق بھی نہیں رکھتا۔ چنانچہ نہ تو ہم یہ مانتے ہیں کہ انسان قائم بالذات ہے (کہ وہ اصلاً عبد ہے) اور نہ ہی اس کے کسی ایسے ماورائے اسلام حق کو مانتے ہیں جس کا جواز ارادۂ خداوندی سے باہر ہو اور جس کے مطابق اسے اظہارِ ذات اور اپنی خواہشات کی ترجیحات طے کرنے اور انہیں حاصل کرنے کا اخلاقی اور قانونی حق حاصل ہو بلکہ اس کا حق بس اتنا ہی ہے جو اس کے خالق نے اسے اپنے نبی کے ذریعے بتادیا۔ اس کے علاوہ وہ جو بھی فعل سرانجام دے گا نافرمانی اور ظلم کے زمرے میں شمار ہوگا اور جسے ختم کردینا ہی ''عدل'' کا تقاضا

(۱) ہیومن رائٹس کی اسلامی تعبیر کے امکانات کی حمایت کرنے والے مسلم مفکرین اس بات کو بنیاد بناتے ہیں کہ مختلف ممالک میں ہیومن رائٹس کی تشریحات میں اختلاف پایا جاتا ہے (مثلاً ہیومن رائٹس پر مبنی بعض دستوری جمہوری ریاستوں میں جنسی تعلقات کی بہت سی صورتوں وغیرہ کی اجازت نہیں دی جاتی) جس سے ثابت ہوا کہ ہیومن رائٹس کی قرآنی تعبیر پیش کرنا ممکن ہے۔ لیکن یہ دلیل بالکل غلط ہے۔ اس میں شک نہیں کہ ابتدا میں ہر ملک اور قوم اپنے تئیں ہیومن رائٹس کو اپنے مذہبی، روایتی وثقافتی خیر کے فریم ورک کے ساتھ ہم آہنگ کرکے اپنانے کی کوشش ہی کرتی ہے مگر جیسا کہ واضح کیا گیا کہ ہیومن رائٹس ''فرد کے حق کی خیر پر فوقیت'' کی حفاظت کرتی ہے لہٰذا وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ روایتی جکڑ بندیاں بے معنی ہوکر تحلیل ہوتی چلی جاتی ہیں۔ مثلاً ساٹھ کی دہائی میں امریکا کے سرکاری ٹی وی چینل اور موجودہ پاکستان کے پی ٹی وی کی ثقافتی حکمت عملی میں کوئی خاص فرق نہ تھا، مگر وقت گزرنے کے ساتھ وہ عریانی وفحاشی کی بلندیوں کو چھونے لگا۔ درحقیقت ہیومن رائٹس فریم ورک کے اندر فرد کے پاس ہمیشہ یہ موقع موجود رہتا ہے کہ وہ خیر کی کسی مخصوص مروجہ تعبیر اور زندگی گزارنے کے کسی مخصوص طریقے کے خلاف بغاوت کرکے اپنے اظہار آزادی کے حق کو استعمال کرلے اور ہیومن رائٹس پر مبنی ریاست بالآخر اس کے اس قانونی حق کو ماننے پر مجبور ہوجاتی ہے۔

ہے۔ انسان کا کوئی ایسا ذاتی حق ہے ہی نہیں کہ جس کا جواز از خود اس کی اپنی ذات ہو چہ جائیکہ وہ حق نا قابلِ تنسیخ بھی ہو۔ ہیومن رائٹس کی بالادستی ماننے کا مطلب ہی انسان کے ''حق'' کو ''خیر'' پر فوقیت دینا اور اس بات کا اقرار کرنا ہے کہ انسان اپنا حاکم خود ہے نیز ''خیر وشر'' کا معیار خواہشاتِ انسانی ہیں نہ کہ ارادۂ خداوندی۔

حقوق وفرائض کی تمام تر تفصیلات کسی مخصوص مقصد کے حصول کا ذریعہ ہوا کرتی ہیں اور مقصد یا تصورِ خیر بدل جانے سے حقوق کی تفصیلات بھی بدل جایا کرتی ہیں۔ شارع کا اپنے بندوں کو حقوق عطا کرنے کا مقصد ''مقاصد الشریعہ'' کے حصول کو ممکن بنا کر اپنے بندوں کے لیے مراسم بندگی بجالاتے رہنا ممکن بنانا ہے جبکہ ہیومن رائٹس فریم ورک فرد کو ان حقوق کا مکلف گردانتا ہے جن کے ذریعے وہ اپنی خوداریت کی زیادہ سے زیادہ تکمیل کر سکے۔ چونکہ ہیومن رائٹس فریم ورک مقاصد الشریعہ کے حصول اور فروغ عبدیت کی بالادستی کو اہم ترین انفرادی واجتماعی مقاصد کے طور پر قبول نہیں کرتا لہٰذا وہ شریعت کی بیان کردہ حقوق کی تفسیر وتحدید کو بھی ماننے سے انکار کرتا ہے۔ اس کے مقابلے میں یہ فریم ورک حقوق کی وہ تفسیر بیان کرتا ہے جن کے ذریعے مساوی آزادی کے اصول پر ایسی معاشرتی تشکیل کو ممکن بنانا ہے جہاں ہر فرد اپنی خواہشات کا زیادہ سے زیادہ مکلف ہوتا چلا جائے۔ ایسی ریاست جو ہیومن رائٹس قانون کی پابند ہو ہرگز مقاصد الشریعہ کی حفاظت وغلبے کا باعث نہیں بن سکتی۔

ہیومن رائٹس اور جمہوری ریاست کی غیر جانب داریت کا دعویٰ

مسلم مفکرین اس دھوکے کا شکار ہوجاتے ہیں کہ ہیومن رائٹس کسی آفاقی، عقلی اور غیر جانب دار تصورِ خیر کی نشاندہی کرتے ہیں۔ اس دھوکے کی وجہ یہ تاثر ہے کہ ہیومن رائٹس فریم ورک میں ہر فرد کے لیے جو وہ چاہنا چاہے چاہنا ممکن ہوتا ہے۔ مگر یہ بات واضح ہے کہ ہیومن رائٹس فریم ورک ہرگز بھی خیر کا کوئی غیر اقداری (Neutral) تصور فراہم نہیں کرتا بلکہ یہ فریم ورک بھی خیر کے ایک مخصوص تصور کو بطور مفروضہ قبول کرتا ہے اور جو بھی ریاست اس فریم ورک کو بالاتر قانون کی حیثیت سے قبول کرتی ہے یہ فریم ورک ریاست سے مطالبہ کرتا ہے کہ وہ خیر کی اس مخصوص تشریح کو فرد ومعاشرے پر غالب کرے۔

سیکولر طبقہ مذہبی تصورِ خیر کو جانب دار قرار دے کر اسے اجتماعی زندگی سے خارج کر دینا

چاہتا ہے۔ یہ طبقہ لوگوں کو یہ دھوکا دینے کی کوشش کرتا ہے کہ چونکہ مذہب کی بنیاد پر قائم شدہ ریاست لازماً جانب دار ہوتی ہے یعنی وہ ریاست خیر کی ایک مخصوص مذہبی تعبیر کے علاوہ دیگر تمام تعبیرات کو باطل قرار دے کر مغلوب کر دیتی ہے لہٰذا مذہب کو ریاستی معاملات سے الگ رکھ کر ایسے قانونی نظام پر ریاست کی تشکیل کی جانی چاہیے جو خیر کے معاملے میں غیر جانب دار ہو کر تمام تصوراتِ خیر کو پنپنے کے مواقع فراہم کرے اور ایسا قانونی نظام ہیومن رائٹس فریم ورک فراہم کرتا ہے۔ مگر مغرب اور سیکولر طبقے کا یہ دعویٰ کہ لبرل سیکولر ریاست خیر کے معاملے میں غیر جانب دار اور اسی لیے Tolerant ہوتی ہے ایک جھوٹا دعویٰ ہے کیونکہ خیر کے معاملے میں غیر جانب داری کا رویہ ممکن ہی نہیں۔ چنانچہ ہیومن رائٹس کے مطابق اصل تصورِ خیر آزادی یعنی ''خیرِ فرد کا حق ہونا ہے''، دوسرے لفظوں میں اصل خیر تمام تصورات خیر کا مساوی ہونا ہے۔ اس تصورِ خیر کے مطابق خیر فرد کی محض اس ''صلاحیت'' کا نام ہے جو اسے اس کی ''ہر چاہت'' حاصل کر سکنے کا مکلف بنا دے، اس سے قطع نظر کہ وہ چاہت کیا ہے [۱]۔ معلوم ہوا کہ یہ کہنا کہ

---

[۱] ہیومن یا سرمایہ دارانہ انفرادیت کیا چاہتی ہے؟ یہ کہ ''میں جو چاہنا چاہوں چاہ سکوں'' (Preference for Preferene Itself) نہ کہ کوئی مخصوص چاہت، کیونکہ جوں ہی میں کسی مخصوص چاہت کو اپنی ذات کا محور و مقصد بناتا ہوں آزادی ختم ہو جاتی ہے جسے ڈاکٹر جاوید اکبر انصاری خوب صورت پیرائے میں یوں کہتے ہیں کہ ''His self can possess ends but cannot be constituted by them''۔ اسی لیے ہم کہتے ہیں کہ مغرب کے پاس خیر کا کوئی Substantive (مثبت، مجسّد یا حقیقی) تصور سرے سے موجود ہی نہیں، کیونکہ جس آزادی کو وہ خیر اعلیٰ گردانتے ہیں اس کا مافیہ یا مشمول کچھ نہیں بلکہ وہ عدم محض ہے۔ یہاں خیر ''کوئی مخصوص چاہت'' نہیں بلکہ ''کسی بھی چاہت کو اختیار کر سکنے کا حق'' ہے۔ دوسرے لفظوں میں مغربی تصورِ خیر درحقیقت عدم خیر (Absence of any Good) یعنی ہر خیر کی نفی کا نام ہے اور یہ عدمِ خیر ہی ان کے خیال میں خیرِ اعلیٰ ہے۔ انہی معنی میں مغربی تصورِ خیر اصلاً شرِ محض (Absolute Evil) ہے کیونکہ شر درحقیقت عدم خیر ہی کا نام ہے، اس کا اپنا علیحدہ کوئی وجود نہیں۔ یہ مقام ان مسلم مفکرین کے لیے لمحہ فکر یہ ہے جو یہ سمجھتے ہیں کہ مغربی تہذیب کی اصل (Inner Core) خیر پر مبنی ہے اور اس کے ظاہر میں کچھ برائیاں اس لیے در آئی ہیں کہ اس خیر کو برتنے میں انسانی کوتاہیاں ہو گئیں۔ اسی طرح معاملہ یہ بھی نہیں کہ اسلام کا ایک تصور خیر ہے اور مغرب کے پاس کوئی دوسرا، بلکہ مغربی تہذیب میں کسی ''بلند اور راست'' مقصد کا وجود ہی سرے سے ناممکن ہے کیونکہ جس شے کو وہ خیر سمجھتے ہیں وہی اصل شر ہے، جسے وہ عدل سمجھتے ہیں وہی اصلاً ظلم ہے اور اسی لیے مارماڈیوک پکتھال فرمایا کرتے تھے کہ مغربی تہذیب درحقیقت تہذیب نہیں ''بربریت'' یعنی تہذیب کی ضد ہے، کیونکہ اصلاً تو تہذیب صرف اسلام ہی ہے۔

''تمام تصوراتِ خیر مساوی ہیں'' غیر جانب داری کا رویہ نہیں بلکہ بذاتِ خود خیر کا ایک مستقل مابعد الطبیعیاتی تصور ہے کہ ''اصل خیر تمام تصوراتِ خیر کا مساوی ہونا ہے'' اور ہیومن رائٹس پر مبنی جمہوری دستوری ریاست لازماً اسی تصورِ خیر کے تحفظ اور فروغ کی پابندی ہوتی ہے۔[۱] مساوی خیر کے اس تصور پر ایمان لانے کے بعد اسلام کے ''الحق'' ہونے کا دعویٰ ایک مضحکہ خیز دعویٰ بن کر رہ جاتا ہے۔ ہیومن رائٹس پر ایمان لانے کا تقاضا یہ مان لینا ہے کہ اسلام ہی واحد حق نہیں ہے بلکہ تمام مذاہب اور نظریہ ہائے زندگی بھی اتنے ہی حق پر مبنی ہیں جتنا اسلام، لہٰذا مسلمانوں کو اسلام کی دوسرے مذاہب اور نظام ہائے زندگی پر برتری کے دعوے سے دست بردار ہوجانا چاہیے اور خصوصاً اقامت دین کی کوششیں ترک کردینی چاہئیں کیونکہ اسی مذہبی برتری کی سوچ کے نتیجے میں مذہبی انتہا پسندی کو فروغ ملتا ہے[۲]۔ ہیومن رائٹس پر معاشرتی تشکیل تب ہی ممکن ہے جب افراد Tolerance کے فلسفے پر ایمان لائیں۔

یہیں سے اس فریب کی حقیقت بھی کھل جانی چاہیے کہ لبرل جمہوری ریاست کوئی Tolerant ریاست ہوتی ہے کیونکہ اپنے دائرۂ عمل میں یہ ریاست صرف انہی تصوراتِ خیر کو برداشت کرتی ہے جو اس کے اپنے تصورِ خیر (یعنی تمام تصوراتِ خیر کی مساوات ولایعنیت) سے متصادم نہ ہوں، اور ایسے تمام تصوراتِ خیر جو ہیومن رائٹس سے متصادم ہوں یا جو کسی ایک چاہت کو بقیہ تمام چاہتوں سے بالاتر سمجھ کر اس کی برتری کے قائل ہوں ان کی بذریعہ قوت بیخ

---

[۱] درحقیقت اس دنیا میں غیر جانب داریت (Neutralism) بمعنی ''عدم رائے'' (No Position) کا کوئی وجود نہیں بلکہ غیر جانب داری کے دعوے کا اصل مطلب ہوتا ہے ''کسی کے مطابق رائے دینا یا فیصلہ کرنا''۔ جو لوگ ان معنی میں غیر جانب داری کا دعویٰ کرتے ہیں گویا وہ تمام اصولوں سے ماورا کہیں خلا میں معلق ہوکر اپنی رائے دے رہے ہیں۔ فی الحقیقت وہ خوش فہمی کا شکار ہیں، غیر جانب دار (Neutral) ہونے کا دعویٰ کرنا محض فریب ہے۔ اس دنیا میں ایسا کوئی مقام نہیں جہاں پہنچ کر انسان غیر جانب دار ہوجائے۔ مثلاً یہ کہنا کہ ''فلاں مسئلے میں آپ مسلمان کے بجائے غیر جانب دار ہوکر غور کریں'' محض بے وقوفی ہے۔ کیا اسلام سے باہر نکل کر انسان کافر ہوتا ہے یا غیر جانب دار؟ کیا کفر بذاتِ خود ایک جانب دارانہ مقام نہیں؟ آئمہ علم الکلام نے ''المنزلة بين المنزلتين'' کے عقیدے کی بیخ کنی اس گمراہی سے امت کو بچانے کے لیے فرمائی۔ عبدیت سے باہر نکل کر انسانی عقل غیر جانب دار نہیں بلکہ خواہشات اور شیاطین کی غلام ہوجاتی ہے۔

[۲] اسی فکر سے متاثر ہوکر وحید الدین خاں اور ان کے فکری ہم نوا جاوید احمد غامدی صاحب افضلیت بین الانبیاء اور اسلام کی دوسرے مذاہب پر کاملیت کے اعتبار سے برتری وغیرہ کے اجماعی مسائل کے خلاف عوام الناس کے دلوں میں وسوسے پیدا کرتے چلے آرہے ہیں۔

کنی کر دیتی ہے جس کی واضح مثال طالبان کی ریاست اسلامیہ کا بذریعہ قوت خاتمہ ہے کہ یہ ریاست مخصوص مذہبی تصور خیر کی برتری کا دعویٰ کرتی تھی اور اسے دیگر تمام تصورات خیر پر غالب کر دینے کے لیے قائم کی گئی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ اگر کسی علاقے میں بسنے والے لوگ اپنی روایت کے مطابق ''ونی کرنے'' یا مذہبی بنیادوں پر ''ستی کرنے'' کو خیر سمجھ کر اپنانا چاہتے ہوں تو ہیومن رائٹس قانون انہیں ان اعمال کی اجازت نہیں دیتا کہ یہ اعمال بنیادی انسانی حقوق کے فلسفے سے متصادم ہیں۔ اسی طرح فرض کریں اگر ایک مسلمان لڑکی کسی کافر سے شادی کرنا چاہے تو ظاہر ہے اسلامی معاشرہ اور ریاست ہرگز اس کی اجازت نہیں دے گی مگر چونکہ ہیومن رائٹس قانون اس فعل کو فرد کا حق قرار دیتا ہے لہٰذا لبرل ریاست میں افراد کو اس فعل کی قانونی اجازت اور ریاستی سرپرستی حاصل ہوگی۔ اگر مسلمان اجتماعیت اس لڑکی پر اپنا تصورِ خیر مسلط کرنے کی کوشش کرے گی تو لبرل ریاست ان کے خلاف کارروائی کر کے ان کی سرکوبی کرنے کی پابند ہوگی۔ چنانچہ ہیومن رائٹس فریم ورک کے تصورِ خیر کے مطابق ''خیر'' کی تعریف تو بدل سکتی ہے مگر خیر کی تعریف متعین کرنے کا ''انسانی حق'' بہرحال ناقابل تبدیل ہوتا ہے۔ چونکہ ہیومن رائٹس ''فرد'' کے حقوق کا تحفظ کرتے ہیں نہ کہ کسی گروہ کے، لہٰذا لبرل جمہوری معاشروں میں سوائے فرد کے تمام اجتماعیتیں (مثلاً خاندان وغیرہ) لازماً تحلیل ہوجاتی ہیں اور جو واحد شے بچ جاتی ہے وہ ہے اکیلا ''فرد'' اور صرف ایسی اجتماعیتیں جو افراد کی اغراض (Self-interest) پر مبنی تعلقات سے وجود میں آتی ہیں۔ درحقیقت لبرل معاشروں میں ریاست جس نظام زندگی کو جبراً مسلط کرتی ہے وہ لبرل سرمایہ دارانہ نظام زندگی ہے جس کے نتیجے میں دوسرے تمام نظام ہوئے زندگی پر عمل کرنے کا دائرہ کار کم سے کم کر ہوتا چلا جاتا ہے[1] چنانچہ ہیومن رائٹس پر مبنی دستوری جمہوری ریاست کا یہ دعویٰ کہ اس نظام زندگی میں ہر فرد کو یہ

---

[1] یہیں سے یہ بات بھی واضح ہوئی کہ فرد، معاشرہ اور ریاست ایک کُل (Orgnaic-whole) کا نام ہے جس کے اجزائے ترکیبی ایک دوسرے کے بغیر قائم نہیں رہ سکتے۔ جو لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ اسلامی ریاست کے قیام کے بغیر اسلامی نظام زندگی پنپ سکتا ہے وہ ایک سراب کی تلاش میں ہیں کیونکہ غیر اسلامی ریاست میں اسلامی انفرادیت اور معاشرت کبھی عام نہیں ہو سکتے۔ ریاست تو نام ہی نظام اقتدار اور جبر کا ہے جس کا مقصد جبری مقبول یا عمومی طور پر برداشت کی جانے والی معاشرتی اقدار کا فروغ ہوتا ہے تو لامحالہ کافرانہ ریاست کافرانہ معاشرت ہی کو مسلط کرے گی جس کے نتیجے میں ایک کافرانہ انفرادیت کے فروغ اور عموم کے مواقع ہی پنپ سکتے ہیں۔ اسی سے یہ بات بھی صاف ہوجاتی ہے کہ ہمارے فقہاء کرام بلاشرعی عذر کیوں کافر ریاستوں میں رہائش اختیار کرنے کے خلاف تھے۔

حق حاصل ہوتا ہے کہ وہ ''جو'' چاہنا چاہے چاہ سکے ایک جھوٹا دعویٰ ہے کیونکہ فرد کو مساوی آزادی (یعنی سرمایہ دارانہ نظام زندگی) رد کرنے کا حق حاصل نہیں ہوتا۔ میں بحیثیت فرد اگر گوشت کھانا چاہتا ہوں تو کھا سکوں، ہمہ وقت کھیلنا چاہتا ہوں تو کھیل سکھوں، مگر میں ایسا کچھ نہیں چاہ سکتا جس سے اصول آزادی یعنی دوسروں کا اپنی چاہت چاہنے اور اسے حاصل کرنے کا حق سلب ہوجائے مثلاً میں یہ نہیں چاہ سکتا کہ کسی شخص کو شرعی منکر (مثلاً زنا کرنے) سے روک دوں کیونکہ جوں ہی میں اپنی اس چاہت پر عمل کرتا ہوں اصولِ آزادی کی خلاف ورزی ہوتی ہے جمہوری ریاست مجھے ایسا کرنے سے بذریعہ قوت روک دے گی[۱]۔ چنانچہ فرد اپنے کسی مخصوص تصورِ خیر مثلاً اظہارِ مذہبیت پر ''بطور ایک حق'' عمل تو کرسکتا ہے مگر اسے ''الحق'' سمجھ کر دیگر تمام تصورات خیر پر غالب کرنے کا ارادہ نہیں کرسکتا کہ ایسا کرنا اصول آزادی کے خلاف ہے اور اگر اصولِ آزادی ہی رد کردیا گیا تو پھر میرا یہ حق کہ میں جو چاہنا چاہوں چاہ سکتا ہوں خود بخود فسخ ہوجائے گا۔ لہٰذا لبرل جمہوری نظام میں ہر فرد ہیومن بننے پر مجبور ہوتا ہے، وہ آزادی کے سوا اور کچھ نہیں چاہ سکتا۔ فرد کی ہر وہ خواہش قانوناً اور اخلاقاً جائز اور قابل تنسیخ ہے جو اصول اظہارِ آزادی کے خلاف ہو یعنی جس کے نتیجے میں دوسروں کی آزادی چاہنے کی خواہش میں تحدید ہوتی ہو۔

درحقیقت خیر کے معاملے میں لبرل جمہوری ریاست بھی اتنی ہی راسخ العقیدہ (Dogmatic) اور Intolerant ہوتی ہے جتنی کوئی مذہبی ریاست کیونکہ دونوں ہی اپنے تصوراتِ خیر سے متصادم کسی نظریے کی بالادستی کو روا نہیں رکھتیں۔ چنانچہ مشہور لبرل مفکر رالز (Rawls)[۲] کہتا ہے کہ مذہبی آزادی کو لبرل ازم کے لیے خطرہ بننے کی اجازت نہیں دی جاسکتی وہ مذہبی نظریات جو لبرل آزادیوں (یعنی فرد کے تعیین خیر وشر کے حق) کا انکار کریں ان کو عملاً کچل دینا اتنا ہی ضروری ہے جتنا کسی وبا کو ختم کرنا ضروری ہوتا ہے۔ پس تمام تصورات خیر کی مساوات ولایعنیت کا مطلب غیر جانب داری نہیں بلکہ مساوی آزادی بطور اصل خیر کا

---

[۱] مجاہدین لال مسجد کے ساتھ ہونے والا سلوک اس کی واضح مثال ہے جہاں ریاست نے زنا کاری پھیلانے والے عناصر کی خبر لینے کی بجائے اصول آزادی کی خلاف ورزی کرنے والے مجاہدین پر مظالم توڑ کر ہیومن رائٹس کا تحفظ کیا۔

[۲] دیکھیے رالز کی کتاب *Theory of Justice*

اقرار ہے۔ یہ اسی کا مظہر ہے کہ پختہ (Matured) جمہوری ریاستوں میں ارادۂ انسانی یعنی ''انسانی حق'' کی بالادستی تمام تصوراتِ خیر پر غالب آجاتی ہے اور کسی مخصوص خیر کی دعوت دینا ایک لایعنی اور مہمل دعوت بن کر رہ جاتی ہے۔ ایسی ریاستوں میں آپ کسی مخصوص خیر (مثلاً مذہبیت) کے حصول کو''بطور ذاتی حق'' کے اختیار تو کر سکتے ہیں مگر اس خیر کو دیگر تصوراتِ خیر اور زندگی گزارنے کے دیگر طریقوں پر غالب نہیں کر سکتے، یہی ہیومن رائٹس کی حقیقت ہے۔

اسلامی حلقے اکثر امریکا پر یہ الزام لگاتے ہیں کہ امریکا عراق وافغانستان وغیرہ میں ہیومن رائٹس کی خلاف ورزی کر رہا ہے جب کہ یہ الزام اصولاً غلط ہے کیونکہ ہیومن رائٹس فریم ورک کے مطابق ایسے لوگ جو ہیومن ہونے کو نہیں مانتے یعنی جو Non-Humans ہیں انہیں قتل کرنا کوئی جرم نہیں۔ ہیومن وہ ہے جو انسان کو قائم بالذات یعنی الصمد سمجھے اور جو حصول آزادی کو دیگر تمام مقاصد زندگی پر ترجیح دے۔ وہ لوگ جو نہ صرف یہ کہ لبرل آزادیوں کے منکر ہوں بلکہ ان کے خلاف عملاً برسرِپیکار ہوں (مثلاً طالبان) تو ان کا قتل عین جائز ہے کہ وہ ہیومن ہیں ہی نہیں، ہیومن رائٹس تو ہیومن کے حقوق ہوتے ہیں نہ کہ عبد کے۔ اسی دلیل کی بنیاد پر امریکا کے لاکھوں اصل باشندوں یعنی ریڈ انڈین کا قتل جائز قرار دیا گیا تھا۔

تنقید کی اہمیت

''اجتماعی زندگی کے لیے اخلاقی حیثیت سے تنقید کی وہی اہمیت ہے جو مادی حیثیت سے صفائی کی ہے۔ جس طرح نجاست اور طہارت کی حس مٹ جانے اور صفائی کی کوشش بند ہوجانے سے ایک بستی کا سارا ماحول گندا ہوجاتا ہے اور اس کی فضا ہر قسم کے امراض کے لیے سازگار بن جاتی ہے، اسی طرح تنقیدی نگاہ سے خرابیوں کو دیکھنے والی آنکھیں، بیان کرنے والی زبانیں اور سننے والے کان اگر بند ہوجائیں تو جس قوم، سوسائٹی یا جماعت میں یہ حالت پیدا ہوگی وہ خرابیوں کی آماجگاہ بن کر رہے گی اور پھر اس کی اصلاح کسی طرح نہ ہو سکے گی۔''

سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ
(تاریخ جماعت اسلامی ۲:۳۹۹)

تفہیم دین مدیر

آج کی دینی اور تعلیمی زندگی کا ایک اہم سوال

کیا 'عقیدے' کی بحثوں میں 'ایمان' گم ہو گیا ہے؟

دینی مدارس، جدید تعلیم اور عصری تصوف میں 'ایمان' کی بحث ڈھونڈنے سے بھی نہیں ملتی

* معین الحسن صاحب ایک مقامی پرائیویٹ کالج میں انگریزی پڑھاتے ہیں۔ عربی اور علوم اسلامیہ کا عمدہ ذوق رکھتے ہیں۔ پچھلے کچھ عرصے سے انہوں نے اپنی فیس بک وال پر یہ بحث چھیڑ رکھی ہے کہ اسلام میں اصل اہمیت ایمان کو حاصل ہے لیکن بعد میں آنے والوں نے ایمان اور ایمانیات کو 'عقیدے' سے بدل دیا اور لا حاصل لمبی چوڑی بحثوں میں الجھ گئے اور ایمان کی حقیقت نظروں سے اوجھل ہو گئی۔ وہ ''عقیدے'' کے لفظ کو رد کرتے ہیں اور شیعہ سُنّی تناظر میں اسے زیر بحث لاتے ہیں۔

* ہم لفظوں کے تنازعے اور شیعہ سُنّی تناظر سے قطع نظر یہ سمجھتے ہیں کہ ان کی رائے میں وزن ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے پیغمبر حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو تلاوت و تعلیم کتاب، تعلیم حکمت اور تزکیہ نفس (۱)، دعوت (۲)، و نذار (۳) اور امر بالمعروف و نہی عن المنکر (۴) کا جو درس دیا تھا اس کا حاصل تھا ''ایمان''۔ یعنی لوگ اللہ، رسول، آخرت اور قرآن حکیم پر ایمان لے آئیں اور اس کے تقاضوں کے مطابق عملی زندگی گزاریں۔ گویا اسلام میں بنیادی اہمیت کی چیز ہے 'ایمان اور عمل صالح'۔ ظاہر ہے عمل صالح کی بنیاد ایمان ہے اور ایمان نام ہے اللہ، رسول، آخرت اور وحی کو ماننے کا۔ یہ ایمان جتنا پختہ ہو گا اتنا ہی زیادہ محرک عمل ہو گا اور جتنا کمزور ہو گا آدمی اعمال میں اتنا ہی ناقص ہو گا۔

قرآن حکیم سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ آخرت میں اللہ تعالیٰ وہی اعمال قبول فرمائیں گے

---

(۱) البقرہ ۲:۱۲۹، البقرہ ۲:۱۵۱، آل عمران ۳:۱۶۴، الجمعہ ۶۲:۲

(۲) آل عمران ۳:۱۰۴

(۳) التوبہ ۹:۱۲۲

(۴) آل عمران ۴:۱۱۰

جو ایمان پر مبنی ہوں گے اور وہ اعمال جنہیں دنیا اچھے، مفید اور نیکی کے کام سمجھتی ہے جیسے بیماروں کے لیے ہسپتال قائم کرنا، غریبوں کی مدد کرنا، یتیم خانے کھولنا، بھوکے کو کھانا کھلانا، غریب بچوں کو تعلیم دلوانا.... اللہ تعالیٰ ان کو آخرت میں کوئی وزن نہ دیں گے اگر وہ 'ایمان' پر مبنی نہ ہوں۔

مسلمان اگر عہد خلافت راشدہ میں دو سپر پاورز کو شکست دینے اور دنیا کے ایک بڑے حصے پر اسلام کو غالب کرنے میں کامیاب ہوئے تو اس طاقت کا بنیادی منبع ایمان تھا اور اس ایمان کی وجہ سے وجود میں آنے والے اعمال صالحہ۔ اور جب مسلمان مغلوب ہو گئے اور کفار نے انہیں غلام بنالیا تو اس ہزیمت ونکبت کی بنیادی فکری وجہ بھی ان کے ایمان کا کمزور ہو جانا تھا جس کی وجہ سے اعمال صالحہ مفقود ہو گئے اور مسلمان صلاحیتوں سے محروم ہو جانے کی وجہ سے کارزار حیات میں دشمن سے شکست کھا گئے۔

اگر ہمارا یہ تجزیہ اور ہماری یہ دلیل ٹھیک ہے، اور ہماری رائے میں یقیناً ٹھیک ہے، تو اس کا مطلب یہ ہے کہ ہمارے زوال سے نکلنے، عظمت گم گشتہ حاصل کرنے اور مسلم نشأۃ ثانیہ کا بنیادی راستہ بھی حصول ''ایمان'' ہے لیکن کیا ہمارے اہل فکر ونظر کو اس حقیقت کا ادراک ہے؟ کیا انہیں ایمان کی اس حقیقت واہمیت کا احساس ہے؟ اور کیا ہماری دینی قوتیں، ہمارے علماء وسکالرز اس ایمان کی بازیافت کے لیے کوشاں ہیں؟ ہمیں تو نظر نہیں آتا، آپ بھی غور سے دیکھ لیجیے۔ اور اگر یہ فروگزاشت ہے تو اس کا ازالہ کون کرے گا؟

* کیا ایمان وایمانیات کی بجائے عقیدے کا لفظ وجود میں آنا بلکہ عقیدہ وکلام کے ڈسپلن (علم کی ایک شاخ) کا وجود میں آنا مسلم علمی روایت سے انحراف تھا؟ اہل علم جانتے ہیں کہ خوارج، شیعہ اور قدریہ کے ایمانیات کے مباحث عہد خلافت راشدہ میں ہی شروع ہو گئے تھے جو بعد میں بڑھتے گئے۔ معتزلہ یونانی فکر سے متاثر ہوئے اور انہوں نے اسلامی عقائد کو عقل کی کسوٹی پر پرکھنا شروع کیا تو مسائل کا اایک دفتر کھل گیا۔ پھر ان کے ردّعمل میں اشاعرہ اور ماتریدیہ ابھرے تو عقیدہ وکلام ایک علم بن گئے اور آج کوئی دینی مدرسہ شاید ہی ایسا ہو جہاں عقیدہ طحاویہ یا عقیدہ نسفیہ پڑھایا نہ جاتا ہو!

اگر کوئی اس علمی ترقی کو ناگزیر کہے تو پھر بھی سوال یہ ہے کہ اس علمی قیل وقال میں وہ 'ایمان' کہیں گم تو نہیں ہو گیا جو سارے اعمال کی اصل تھا؟ اگر کوئی کہے کہ یہ تصوف کی نذر ہو گیا تو وہاں بھی ہمیں دو گروہ نظر آتے ہیں۔ صوفیوں کا جو گروہ فلسفی ہے وہ صدور، حلول، وجود، شہود وغیرہ کی لاطائل بحثوں میں الجھ گیا اور صوفیاء کا جو گروہ تزکیہ و تربیت سے متعلق تھا وہ بھی غیر اسلامی افکار و رسوم سے مملو نظر آتا ہے۔ پھر ابتداء کے محقق صوفیاء با قاعدہ عالم دین ہوتے تھے اور ایمان کی بحثوں اور ایمان کی حقیقت سے واقف تھے لیکن دور متاخرین اور خصوصاً عصر حاضر کے بے شمار صوفیا تو شاید 'حقیقت ایمان' اور 'عقیدہ، کلام اور فلسفہ قدیم وجدید' کی بحثوں سے شاید واقف ہی نہیں۔

* سوچنے کی ایک بات یہ بھی ہے کہ 'ایمان' تو ایک اصل ہے۔ سوال یہ ہے کہ توحید، رسالت، آخرت، وحی پر ایمان نے صدر اوّل اور قرون مابعد میں جس طرح کی شخصیت کی تشکیل دی تھی، کیا آج عصر حاضر میں بھی 'ایمان' اگر موجود ہو تو ویسی ہی شخصیت کو جنم دے گا یا وہ ''عصری تقاضوں'' کے مطابق نئی شخصیت ہوگی۔ نیز آج کی جدید عصری تعلیم کی نصابی کتب اور دینی مدارس کے نصابات میں 'ایمان' اس حوالے سے کیسے زیر بحث لایا جا سکتا ہے جس تناظر میں ہم نے سطور بالا میں اس کا ذکر کیا ہے؟

* ہم اہل علم سے درخواست کرتے ہیں کہ وہ ہماری ان گزارشات پر توجہ فرمائیں۔ اگر کوئی اہل علم اس بحث کو آگے بڑھانا چاہیں تو البرہان کے صفحات حاضر ہیں۔

سنا ہے میں نے غلامی سے امتوں کی نجات
خودی کی پرورش اور لذتِ نمود میں ہے

تری دوا نہ جنیوا میں ہے، نہ لندن میں
فرنگ کی رگِ جاں پنجۂ یہود میں

زمانہ اب بھی نہیں جس کے سوز سے غافل
میں جانتا ہوں وہ آتش ترے وجود میں ہے

اقبالؒ

اتحادامت ڈاکٹر اختر حسین عزمی

آدابِ اختلاف

بدگمانی سے پرہیز

''بھئی لال کنویں والی مسجد کے امام کی قراءت بہت دل نشیں اور پُر اثر ہے۔صبح کی نماز ان کے پیچھے پڑھنی چاہیے۔''

یہ بات مولانا احمد حسن امروہیؒ نے اپنے ہم جولیوں مولانا محمود حسنؒ اور حاجی امیر شاہ خاںؒ کی موجودگی میں کہی۔ یہ سب لوگ دارالعلوم دیوبند کے ابتدائی طالب علم اور بانی استاد مولانا قاسم نانوتویؒ کے شاگرد تھے اور آج کل اپنے استاد کے ہمراہ دہلی آئے ہوئے تھے۔

''تمہیں شرم نہیں آتی؟ وہ ہمارے حضرت (نانوتویؒ) کی تکفیر کریں اور ہم ان کے پیچھے نماز پڑھنے جائیں۔'' مولانا محمود حسنؒ نے سخت لہجے میں کہا۔

یہ جملے ان سب کے استاد مولانا نانوتویؒ کے کان تک بھی پہنچ گئے۔ اگلی صبح انہوں نے اپنے شاگردوں کو ہمراہ لیا اور لال کنویں والی مسجد پہنچ گئے اور جماعت کے ساتھ نماز پڑھی۔ سلام پھیرنے کے بعد نمازیوں نے دیکھا کہ ہیں تو علماء صورت لیکن اجنبی ہیں اور صبح کی نماز میں اتنے سارے اجنبی لوگوں کا آنا ایک قابل تعجب بات تھی۔ لہٰذا پوچھا: ''کون ہو؟''

''یہ حضرت مولانا قاسم نانوتویؒ ہیں۔'' حاجی امیر شاہ خاںؒ نے اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ''اور یہ آپ کے شاگرد رشید مولانا محمود حسنؒ اور مولانا احمد حسنؒ امروہی ہیں۔''

یہ سن کر امام صاحب کو سخت حیرت ہوئی کہ مَیں رات دن ان کی تکفیر کرتا ہوں اور یہ میرے پیچھے نماز پڑھنے آ گئے۔ اس نے آگے بڑھ کر مصافحہ کیا اور کہا:

''حضرت! میں تو آپ کی تکفیر کرتا تھا جبکہ آپ میرے پیچھے نماز پڑھنے چلے آئے۔ میں بہت شرمندہ ہوں۔''

''میرے دل میں آپ کے اس جذبے کی قدر ہے کیونکہ آپ نے مجھے توہین

رسول (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کا مرتکب سمجھ کر میری تکفیر کی ہے۔ یہ آپ کی غیرتِ ایمانی کا تقاضا تھا۔ گلہ صرف اتنا ہے کہ جو خبر آپ تک پہنچی تھی آپ اس کی تحقیق تو کر لیتے کہ خبر صحیح بھی ہے یا نہیں'' کچھ دیر توقف کے بعد مولانا نانوتویؒ گویا ہوئے:

''اب میں یہ عرض کرنے آیا ہوں کہ آپ کو جو خبر پہنچی ہے وہ غلط ہے اور میں خود اس شخص کو دائرۂ اسلام سے خارج سمجھتا ہوں جو ادنیٰ درجہ میں بھی نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی توہین کرتا ہے اور اگر آپ کو یقین نہ آئے تو آپ کے ہاتھ پر ابھی اسلام قبول کرتا ہوں: اَشْهَدُ اَن لَّا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَاَشْهَدُ اَنَّ مُحَمَّدًا عَبْدُهٗ وَرَسُوْلُهٗ.

یہ سن کر امام صاحب بچھے جا رہے تھے۔[۱]

حقیقت یہ ہے کہ آج ہمارے ہاں اختلاف اتنا زیادہ نہیں ہے جتنی آپس میں ہم نے بدگمانیاں پالی ہوئی ہیں۔ ہر ایک دوسرے کے عقیدے، عمل اور اس کے اخلاص کے بارے میں بدگمان ہے۔ یعنی دلیل کے بغیر ہی ہم نے ایک دوسرے کے بارے میں ایک رائے قائم کر لی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے بدگمانی کو گناہ قرار دیا ہے اور اس سے اجتناب کا حکم دیا ہے[۲]۔

اہل حدیث کا گمان ہے کہ بریلوی توحید کو نہیں مانتا جبکہ بریلوی سمجھتا ہے کہ اہل حدیث کو رسول کی گستاخی کا شوق ہے۔ شیعہ کی بدگمانی ہے کہ دیوبندی اہل بیت کے دشمن ہیں۔ یہ بدگمانیاں دور رہ کر نہیں، قریب ہو کر ہی دور ہو سکتی ہیں، جب یہ ایک دوسرے کا موقف اور دلائل سنیں۔ جامعہ اشرفیہ کے مہتمم مولانا عبدالرحمن اشرفیؒ کو ایک اجتماع میں یہ کہتے سنا کہ آپس کی بدگمانی کا حل یہ ہے کہ علماء کے جب بھی مشترکہ اجلاس ہوں، ان میں اہل حدیث عالم کو کہا جائے کہ وہ شان رسالت اور شانِ اولیاء پر گفتگو کرے، بریلوی توحید پر اور دیوبندی اہل بیت کی عظمت اور محبت پر بات کرے تو دوسروں کی آنکھیں کھلیں گی کہ جن باتوں کے ہم دعوے دار ہیں، دوسرے بھی ان کو مانتے ہیں۔

---

[۱] ماخوذ از فروعی اختلافات از قاری محمد طیب (مہتمم دار العلوم دیوبند) ص: ۴، ۵

[۲] الحجرات ۴۹: ۱۲

ایک لوہاکی　　پروفیسر ملک محمد حسین

اللہ ہمارے حال پر رحم فرمائے

ہم احمق ہیں اور احمق بنتے رہیں گے، ہم جذباتی ہیں اور جذباتی پن میں لٹتے رہیں گے، ہم مذہبی ہیں اور مذہب کے نام پر اُلو بنتے رہیں گے۔ کبھی ہمیں سیاستدان استعمال کرتے ہیں تو کبھی علمائے کرام۔ کبھی ہم کو حب الوطنی کے بہانے ماموں بنایا جاتا ہے تو کبھی ان کے نام پر جو ہمارے لیے جانیں ہتھیلی پر رکھ کر ہر وقت جان بازی کے لیے تیار رہتے ہیں۔ ہمیں استعمال کرنے والے چند درجن ہوں گے اور ہم استعمال ہونے والے لاکھوں کروڑوں ہیں۔ ہمیں نہ تو سردی کی پرواہے نہ گرمی کی۔ ہمیں نہ پیاس لگتی ہے نہ بھوک۔ ہمیں استعمال کرنے والے ائیر کنڈیشنڈ ماحول میں موجیں اڑاتے ہیں اور ہم آنسو گیس بھری فضا میں زندہ باد مردہ باد کے نعرے لگاتے ہیں اور جنت کا خواب آنکھو میں لیے زمین پر سو جاتے ہیں؟ ہم کیسے لوگ ہیں اور ہمیں استعمال کرنے والے یہ منافق لوگ کیسے لوگ ہیں؟ نہ استعمال کرنے والوں کو شرم آتی ہے اور نہ استعمال ہونے والوں کو اپنی عزت نفس کا خیال آتا ہے۔ کبھی ہم گلگت بلتستان کے برف زاروں میں منجمد ہو رہے ہوتے ہیں تو کبھی تھر اور چولستان کے صحراؤں میں جل رہے ہوتے ہیں۔ کبھی شاہراہِ دستور اور ڈی چوک میں خیمہ زن ہوتے ہیں تو کبھی فیض آباد چوک میں سردی سے بچنے کے لیے آگ تاپ رہے ہوتے ہیں۔ کبھی ہمیں کرکٹر بے وقوف بناتا ہے تو کبھی کینیڈین بہرد پیا۔ کبھی لبیک کی گونج میں ہمیں مست کیا جاتا ہے تو کبھی انقلاب اور نئے پاکستان کے سراب میں مبتلا کر دیا جاتا ہے۔ ہم ختم نبوت کے تحفظ کے لیے جان بھی قربان کر دیں اور حرمت رسول ﷺ کے لیے ہمارے ماں باپ اور والدین بھی قربان ہو جائیں۔ ہم دین کی سربلندی کے لیے اپنی ساری عمر لٹا دیں اور اقامت دین کے لیے دن رات ایک کر دیں لیکن جھوٹے نعروں اور اپنے مفاد کی خاطر ہمارے نام نہاد قائدین ہمیں بے وقوف تو نہ بنائیں۔ نعرہ بازی میں ہم نے آدھا ملک گنوادیا۔ ہم نعرے لگاتے رہے اور سیکولرزم لبرلزم ہمارے گھروں کی دہلیز پار کر کے ہمارے آنگن میں داخل ہو گیا۔ ہم ریلیاں اور جلوس نکالتے رہے اور دشمن خاکے بنا بنا کر ہمارا مذاق اڑاتا رہا۔ دشمن قدم بقدم آگے بڑھتا رہا اور ہم قدم قدم پر ایک دوسرے کا گلا کاٹتے رہے۔ ہمارے دین وایمان کے محافظ، ہماری جان ومال کے محافظ اور ہمارے حقوق کے محافظ ہمارا سب کچھ لوٹتے رہے اور ہمیں کنگال کرتے رہے اور ہم ان کے اشاروں پر ناچتے رہے اور اپنے آپ کو دنیا کے سامنے تماشا بناتے رہے۔ اللہ ہمارے حال پر رحم فرمائے۔

تبصرۂ کتب مدیر

کتاب نما

میرا نہ بن اپنا تو بن از حافظ محمد موسیٰ بھٹو (حیدرآباد، سندھ)

حافظ محمد موسیٰ بھٹو صاحب گنتی کے ان چند افراد میں سے ہیں جو صحیح معنوں میں ملت کا سرمایہ ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے انہیں اتنی صلاحیت اور جذبے سے نوازا ہے اور اتنا رواں قلم عطا فرمایا ہے کہ انہوں نے اکیلے کئی اداروں جتنا کام کیا ہے۔ وہ ساٹھ سے زیادہ کتابوں کے مصنف ہیں اور اس وقت بھی جبکہ وہ عالم پیری وضعف میں ہیں، حالت یہ ہے کہ ہر مہینے دوسرے ان کی نئی کتاب موصول ہوجاتی ہے۔ نوجوانوں کے مسائل پر ان کی کتاب پچھلے ماہ موصول ہوئی تھی اور راقم اس پر تبصرہ کرنا چاہتا تھا کہ کوئی صاحب بغیر بتائے میز پر سے اٹھالے گئے۔ حافظ صاحب کی تازہ کتاب ''میرا نہ بن تو نہ بن اپنا تو بن'' اسلامیت، روحانیت اور شعور ولاشعور کے مختلف اہم پہلوؤں پر مضامین کا مجموعہ ہے۔ کاش حافظ صاحب کی کتابیں سارے اردو پڑھے لکھے لوگوں تک پہنچ سکیں۔ ۱۲۸ صفحات کی اس کتاب کی قیمت ۱۰۰ روپے ہے اور یہ سندھ نیشنل اکیڈمی ٹرسٹ۔ ۴۰۰ بی۔ لطیف آباد ۴، حیدرآباد (سندھ) سے حاصل کی جاسکتی ہے۔

'دنیا سے غربت اور جہالت کے خاتمے کا عالمگیر منصوبہ' اور 'عالمگیر جشن'

از ڈاکٹر اختر احمد

ڈاکٹر اختر احمد صاحب نہ پی ایچ ڈی ہیں نہ ایم بی بی ایس بلکہ مائنڈ سائنس ایکسپرٹ ہیں۔ ان کا قلم ماشاء اللہ رواں ہے اور بہت سی کتابوں کے مرتب ومولف ہیں۔ حوالہ دینے کی ضرورت محسوس نہیں کرتے البتہ محنت سے اچھی باتیں دینی اور سائنسی کتابوں سے جمع کرنے کا ہنر جانتے ہیں۔ ان کی کتابوں میں 'ذکر اللہ'، 'اسلام دین فطرت'، 'اسلام کا دنیا پر بہت جلد دوبارہ عروج'، 'قرآن کا آفاقی اور انقلابی پیغام' وغیرہ ہیں۔ ان سے کتابیں حاصل کرنے کے لیے فون: 0333-5242140 پر رابطہ کیا جاسکتا ہے۔